نذیر عباسی نمبر
ہفت روزہ
مزدور
jeddojuhd.com
جدوجہد
15 تا 21 اکتوبر 2009ء
قیمت 10 روپے
کیا شور لہو کا تھا
کیا گونج تھی نعروں میں
ایوانِ عدالت میں
پتھرائے ہوئے کمرے
دم روک کے سنتے تھے
جب سرخ سلام آیا
مقتول کا نام آیا
گھونسہ سا لگا دل پر
آنکھوں سے لہو پھوٹا
جیتے رہو دل والو
پتھر تو کوئی ٹوٹا

آخری معرکہ

ندیم سبطین

سیاست اب نہیں ہو گی۔ یہ کچھ دن بعد میں ہو گی

زمیں پہ جابجا جب زلزلہ ہی زلزلہ ہو گا
کہ طوفانوں کا سیلابوں کا بھی اک سلسلہ ہوگا
یہی تو جبر یعنی مفلسوں پہ برملا ہوگا

مگر کچھ ہوں گے جن کی زندگی جنت نما ہوگی
سیاست اب نہیں ہو گی یہ کچھ دن بعد میں ہوگی

پہاڑ اب روئی کے گالوں کی صورت اُڑتے جائیں گے
سمندر پھٹ پڑیں گے اور تارے ٹوٹ جائیں گے
تپش سورج کی ہو گی پودے اگنا بھول جائیں گے

قیامت خیز منظر میں یہ جنتا پس رہی ہو گی
سیاست اب نہیں ہو گی یہ کچھ دن بعد میں ہو گی

مگر کچھ لوگ لوٹا ہے جنہوں نے ان خزانوں کو
چھپا کے رکھ دیا ہم سے ہی زمانوں کو
نیا مقتل بنایا جس نے اُلفت کے ترانوں کو

وہ ٹولی سُرخرو ہو گی خلاء میں رہ رہی ہو گی
سیاست اب نہیں ہو گی یہ کچھ دن بعد میں ہو گی

وہ جب ہو گی بلندی پر شعورِ آدمی ہو گا
مذاہب، نسل و ملت سے بلند تر سوچتا ہو گا
حقوق و فرض کو ہر شخص ہی پہچانتا ہو گا

یہ ٹولی کے لیے اک وقت آخر کی گھڑی ہو گی
سیاست اب نہیں ہو گی یہ کچھ دن بعد میں ہو گی

☆

مزدور جدوجہد کی اشاعت کا آغاز 1980 میں ایمسٹرڈیم (ہالینڈ) سے ہوا۔ 1986 میں پاکستان سے شائع ہوا۔ 1997 میں ہفت روزہ اشاعت ہوئی۔ مزدور جدوجہد مزدور تحریک کی مدد سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا مقصد طبقاتی تحریک کی تعمیر ہے۔

مسلسل اشاعت کا 29 واں سال

ہفت روزہ مزدور جدوجہد لاہور

15 تا 21 اکتوبر 2009ء

جلد نمبر 21 اشاعت نمبر 619 شمارہ نمبر 40

ایڈیٹر: طلعت رباب ٹائٹل: نوید بٹ، کمپوزنگ/ڈیزائننگ: محمد علی، نوید علی

اس شمارے میں

اداریہ

جی ایچ کیو پر حملہ

10 اکتوبر کو فوج کے مرکز، جنرل ہیڈ کوارٹرز (جی ایچ کیو)، پر حملہ مذہبی جنونی قوتوں کی جانب سے پاکستانی ریاست پر ہونے والا سب سے بڑا علامتی حملہ ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق درجن بھر افراد ہلاک ہوئے، جی ایچ کیو کے اندر کئی گھنٹے تک چالیس افراد کو یرغمال بنا کر رکھا گیا۔ کمانڈو آپریشن کے بعد ہی جی ایچ کیو پر قبضے کو ختم کروایا جا سکا۔ حملے کے بعد حسب معمول وحسب توقع آپریشن کامیاب قرار دیا گیا۔ وزیر اعظم اور صدر نے فوجی سربراہ کو مبارکباد دی۔ وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے طالبان پر غیر ملکی قوتوں پر کام کرنے کا الزام لگایا۔ محکمہ تعلقات عامہ میں تادم تحریر لکھی جا رہی پریس ریلیزوں میں اس حملے کو طالبان کی 'بدحواسی' قرار دیا جا رہا ہوگا۔

ادھر میڈیا میں چھوٹی چھوٹی بعض خبریں مختلف تصویر پیش کر رہی ہیں۔ ایک خبر یہ ہے کہ 15 جولائی کو ہی خفیہ اداروں نے یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ جیش محمد اور لشکر جھنگوی والے اس انداز میں جی ایچ کیو پر حملہ کریں گے۔ انگریزی روزنامے 'دی نیوز' نے بھی یہ کریڈٹ لیا ہے کہ اس حملے کی پیش گوئی وہ کر چکا تھا۔

ایسے میں مبارکباد کے پیغامات، غیر ملکی قوتوں یا طالبان کی مبینہ بدحواسی چہ معنی دارد؟ جی ایچ کیو پاکستان کا محفوظ ترین قلعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس پر تو ایک پتھر پھینک دیا جانا بھی طالبان کی کامیابی تصور کیا جاتا کجا یہ کہ وہ چوبیس گھنٹے اس پر قبضہ جمائے بیٹھے رہیں۔ دہشت گردوں کا مقصد تو فقط سنسنی پھیلانا تھا۔ انہوں نے جی ایچ کیو پر مستقل قبضہ تو نہ جمانا تھا۔ پھر فوج کے ترجمان کس خوش گمانی میں 'آپریشن کامیاب رہا' کا اعلان کرتے پھر رہے ہیں اور مبارکباد کے یہ پیغامات کس کو دھوکہ دینے کے لئے ہیں؟

جہاں تک رحمٰن ملک کے 'مبینہ غیر ملکیوں' کا تعلق ہے تو یہ قوت یا امریکہ ہو سکتی ہے یا بھارت۔ نوائے وقت مکتبہ فکر کے مطابق اول الذکر پاکستان کے ایٹمی ہتھیار ہتھیانا چاہتا ہے جبکہ ثانی الذکر پاکستان کا وجود ہی صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتا ہے۔ اگر اس تھیوری کو مان لیا جائے تو پھر رحمٰن ملک اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ امریکہ انکی حکومت کو القاعدہ سے لڑنے کے لئے اربوں ڈالر کیوں دے رہا ہے؟ رہا بھارت تو کیا وہ اتنا احمق ہے کہ ان سنپولیوں کو پالے جو سانپ بن کر اسے ڈسیں؟ کیا بھارت کو نہیں معلوم کہ یہی 'طالبان' کشمیر میں لڑیں گے، ممبئی اور لال قلعے پر حملے کریں گے کہ وہ گذشتہ بیس سال سے ایسا کرتے آ رہے ہیں۔

افسوس کہ سچ کو تسلیم کرتے ہوئے، عوام کو بے وقوف بنانے کی بجائے، اصل مسئلے کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مذہبی جنونی قوتوں کے جہادی ڈھانچے (انفرا سٹرکچر) کو ختم کرنے کی بجائے، طالبان کے خلاف سلیکٹو (selective) کارروائی کی جا رہی ہے۔ کچھ کو 'اچھا طالبان' قرار دیکر، ان سے چشم پوشی کی جا رہی ہے۔ کچھ 'برے طالبان' ہیں جن کو جسمانی طور پر ختم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ایک طرف سوات اور قبائلی علاقوں میں کارروائی ہو رہی ہے دوسری جانب جنوبی پنجاب میں جیش محمد نئے تربیتی مراکز کھول رہی ہے۔ پھر یہ کہ خطے میں عدم استحکام کی جڑ: افغانستان پر امریکی قبضے پر حکومت خاموش ہی نہیں، معاون کا کردار ادا کر رہی ہے۔ پاکستانی فوج کا خیال ہے کہ کل جب امریکہ سوویت روس کی طرح افغانستان سے واپس جائے گا تو وہ 'اچھے طالبان' کی مدد سے ایک مرتبہ پھر کابل پر قبضہ جما سکے گی۔ اسی طرح جب امریکہ کی توجہ کہیں اور مبذول ہو جائے گی تو وہ کشمیر میں پھر 'اچھے طالبان' کو لانچ کرے گی۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ طالبان اب کی بار کابل کی جانب مارچ نہیں کر پائیں گے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ کابل کی طرف ناکام مارچ کے بعد 'بدحواسی' میں وہ اسلام آباد پر حملے کرتے رہیں گے۔

(نذیر عباسی شہید پر خصوصی نمبر کی اشاعت کیلئے ضروری تھا کہ اداریہ بھی نذیر عباسی شہید پر لکھا جاتا لیکن موجودہ صورتحال کے پیش نظر اداریہ کے موضوع کو تبدیل کر دیا گیا ہے)

نوٹ: "نذیر عباسی نمبر" کی اشاعت میں مدد اور رہنمائی کیلئے ادارہ 'مزدور جدوجہد' معروف محقق و دانشور احمد سلیم اور نذیر عباسی شہید کی شریک حیات حمیدہ گھانگھرو کا انتہائی مشکور ہے۔ نہ صرف ان دونوں ساتھیوں نے دستاویزات اور مضامین کی فراہمی میں مدد دی بلکہ ان کے قیمتی مشورے، مدد اور حوصلہ افزائی بھی قدم قدم شامل رہی۔ مدیر

رابطہ: ہفت روزہ مزدور جدوجہد، صوفی مینشن، 7۔ ایجرٹن روڈ، لاہور
Weekly Mazdoor Jeddojuhd, Sufi Mansion 7- Egerton Road, Lahore.
فون: 042-6305645 فیکس: 042-6271149 ای میل: talkmj@yahoo.com
ویب سائٹ: www.jeddojuhd.com

شرح خریداری سالانہ
پاکستان: 600 روپے، یورپ اور امریکا: 50 امریکی ڈالر
افریقہ: 45 امریکی ڈالر، خلیجی ریاستیں: 40 امریکی ڈالر

پبلشر فاروق طارق نے شاخت پریس سے چھپوا کر 40۔ ایبٹ روڈ، لاہور (پاکستان) سے شائع کیا

شہید نذیر عباسی ایک دور، ایک تاریخ

کشور حمیدہ گھانگھرو

باضمیر عدالت میں نذیر انقلابی فاتح ہے

نذیر عباسی پر لکھنا میرے لیے مشکل بھی ہے مگر جب سوچتی ہوں کہ تاریخ میں ایسے لوگ کبھی نہیں مرتے جو ظالمانہ سماج کی فرسودہ بے بنیاد طبقاتی نظام کی دیوار کو کھوکھلا کرکے گرانے کا عزم کریں۔ مائیں سالوں میں ایسے بیٹوں کو جنم دیتی ہیں جو موت کو بھی مار کر تاریخ میں سرخرو ہوجاتے ہیں۔ ہم سب مریں گے مگر جو مر کر بھی کوئی زندہ رہیں ایسے انقلابی تاریخ کو سنوارتے ہیں۔

نذیر کے قاتلوں کو بے نقاب کرنے کے لئے عدالتی کمیشن قائم کیے جائیں تاکہ نذیر عباسی کی جدوجہد کے سرخ جھنڈے کا لہو میلا نہ ہو

جب بھی انقلابی قافلے کے سپاہیوں کی تاریخ لکھی جائے گی نذیر عباسی کا نام سنہری حروف سے لکھا ہوا دل کو چھوتا ذہن کو جھنجھوڑتے جدوجہد کا حوصلہ دیتے ہوئے فخر کا احساس دلائے گا۔

جو نظریاتی ساتھی ہوتے ہیں ان کا جنم جنم کا رشتہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے دکھ درد، مسائل ایک جیسے ہوتے ہیں اور ان کی جدوجہد کی منزل بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ صرف پارٹی کا منشور الگ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے طریقہ کار میں فرق ہوتا ہے مگر نذیر عباسی کی شہادت وہ منزل تھی جو سچائی کے مجرم کہلوانے والے جرم آگہی تھی۔

نذیر عباسی پر لکھنا میرے لیے مشکل بھی ہے مگر جب سوچتی ہوں کہ تاریخ میں ایسے لوگ کبھی نہیں مرتے جو ظالمانہ سماج کی فرسودہ بے بنیاد طبقاتی نظام کی دیوار کو کھوکھلا کرکے گرانے کا عزم کریں۔ مائیں سالوں میں ایسے بیٹوں کو جنم دیتی ہیں جو موت کو بھی مار کر تاریخ میں سرخرو ہوجاتے ہیں۔ ہم سب مریں گے مگر جو مر کر بھی کوئی زندہ رہیں ایسے انقلابی تاریخ کو سنوارتے ہیں۔

نذیر نے اپنی جان دے کر نظریے اور جدوجہد کرنے والوں کو اعتماد دیا۔ حالانکہ نذیر عباسی کی شہادت کی خبر زہر کے جام سے کم نہ تھی۔ اس جدوجہد کے اکیلے سپاہی کو کسی گمنام قبر میں دفنایا جاتا ہے۔ ستارا یدھی اور فوج کے کچھ رکھوالے لال کفن میں نذیر کی لاش کو تخی حسن کے ایک کونے میں دھرتی ماں کی گود میں سلا دینے کے بعد اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے ملک دشمن کو ختم کر ڈالا۔ یہ خبر خود ان کیلئے وبال جان ہوجاتی ہے۔ نذیر عباسی نے اس اندھیری رات کو اپنے خون سے بجھے ہوئے دیے کو جلا کے روشن کیا۔ وہ مرا نہیں تھا۔ مرتے وہ لوگ ہیں جو اپنے ضمیر کا سودا کرتے ہیں جو خواہشات کی صلیب پر لٹکے ہوتے ہیں، وہ بھٹکنے میں بھی دیر نہیں کرتے۔

نذیر عباسی انقلابی جدوجہد کا ٹائٹل ہے اس کا جرم کمیونسٹ کہلوانا تھا اور اس نے کہا ایسا جرم میں بار بار کرتا رہوں گا۔ اس نے بارود کی بدبودار آوازوں میں بھی کہا میں کمیونسٹ ہوں۔ مجھے ماروگے تو یہاں ایک نہیں، دو نہیں ہزاروں نذیر پیدا ہونگے۔ اسے یقین تھا کہ مارکسزم سوشل سائنس ہے۔ وہ سماج کا تجزیہ، جائزہ اور تجربہ بھی اسی بنیاد پر کرتا تھا۔ اس لیے مارکس نے کہا سچائی منزل بھی ہے اور اس منزل پر پہنچنے کا راستہ بھی۔ سچائی کی تلاش بھی سچی ہونی چاہیے۔ اس لیے سچی تلاش خود ترقی یافتہ سچائی ہے۔ کامریڈ کہلوانے والے تو بہت ہیں مگر کامریڈوں کی طرح ثابت قدم رہنے والے بہت کم۔

نذیر عباسی نے محنت کشوں کے حقوق کی بات کی اس نے آخری گھڑی میں بھی کہا ہوگا کہ میری موت جدوجہد کی پکار ہے میری زندگی ایک گیت ہے۔

آج جب ہم سب ساتھی اس گیت کو دہراتے ہیں تو واقعی درد، محبت، سچائی، وفاداری، احساس، جذبات کی خوشبو 29 سالوں میں بھی ختم نہ ہوسکی ہے۔ چاہے بریگیڈیئر امتیاز جیسے۔ تاریخ اور نذیر کے ساتھی جو خود اس وقت نذیر کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے، جن پر خود بھی ٹارچر ہوا، شبیر شر، کمال وارثی، پروفیسر کمال کہہ رہے ہیں کہ ہم آنکھوں دیکھے گواہ ہیں۔ نذیر عباسی کو تشدد کرکے مارا گیا اور وہ صاحب (بریگیڈیئر امتیاز) کہہ رہے ہیں ان کی موت قدرتی ہوئی، دل کا دورہ پڑنے سے فوت ہوگئے۔ جب کہ اس سے پہلے یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ مجھے پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی لیفٹ جدوجہد کو ختم کرنے کا حکم ملا اور میں اس میں کامیاب ہوگیا اور نذیر عباسی کی پارٹی را کی ایجنٹ تھی۔ اب یہ تو تاریخ گواہ ہے کہ کون را کا ایجنٹ ہے یا کون ملک دشمن مگر بریگیڈیئر خود اپنی زبانی جو بیان دے چکے ہیں اس میں اندازہ اور اشارہ ملتا ہے کہ ان کا اس کیس سے کتنا تعلق تھا۔ میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ اگر نذیر عباسی کی قدرتی موت تھی تو اس کی لاش کو چوروں کی طرح اندھیری رات میں کیوں لاوارث کرکے ستارا یدھی کے سہارے تخی حسن میں دفنایا گیا جب کہ نذیر کے دور کے رشتے دار ولی محمد شاہ کا اسرار تھا کہ اس کے ورثاء کے حوالے کیا جائے مگر لاش دینا تو دور کی بات اطلاع تک نہ دی گئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ 26 سالہ نوجوان نذیر عباسی کبھی بھی دل کے عارضے میں مبتلا نہ رہے۔ وہ خوش مزاج، صحت مند، خوبصورت نوجوان تھے۔ اگر اس کی لاش کو عوام کی عدالت میں لایا جاتا تو جو کندھے نذیر عباسی کی آخری آرام گاہ تک اپنے جہادی ساتھی کو لے جاتے کئی گناہ زیادہ انصاف کی آوازیں اور سچائی کے ہاتھ ظالموں کے گریبانوں کو پکڑ کر کہتے کہ اس کے زخمی جسم کو گھاؤ دینے والے مجرم کہاں ہیں اور شاید آج اس وقت کے ظلم کرنے والے رکھوالوں کو یہ کہنے کی جرات نہ ہوتی کہ نذیر عباسی دل کے دورے سے مرے ہیں۔ ہاں مگر آج بھی ہر باشعور تاریخ کو سمجھنے اور پرکھنے والے والے سمجھتے ہیں کہ ایسے گھاؤ انقلابیوں کے مقدر میں ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کی پرواہ کیے بغیر موت کو گلے لگا دیتے ہیں۔ آج جب یہ کیس دوبارہ عوام کی عدالت میں آیا

دائیں سے امرلال، تاج مری، نذیر عباسی، حمیدہ گھانگھرو اور زبیدہ گھانگھرو

ہے۔ یہ پنڈورہ باکس دوبارہ کھلا ہے تو میں نہیں کہہ سکتی کہ ہم نے تاریخ کو بھلا دیا ہے یا مصلحتاً خاموشی بھرے انتقام کا فارمولا ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتی ہوں تاریخ کے سب سے زیادہ اور بڑے مجرم وہ ہوتے ہیں جو اپنی تاریخ اور شہیدوں کی جدوجہد کو بھلا دیتے ہیں۔ ہم اپنے شہیدوں اور ان کی جدوجہد کے وارث ہیں۔ ہم آنے والی نسلوں کے لیے آج بھی نذیر عباسی شہید کے قاتلوں کو بے نقاب کرنے کا مطالبہ کریں گے۔ اس لیے کہ انقلاب کی تاریخ کی خوبصورتی ہی اس سے ہے کہ جو قربانیاں دینے والے ہوتے ہیں وہ وقتی طور کی تبدیلی کے قائل نہیں ہوتے ہیں۔ وہ سماج کی طبقاتی کشمکش اور فرق کو مٹا کے آنے والی نسلوں کی راہ روشن کرتے ہیں تا کہ پھر کسی جابر ظالم کو یہ موقع نہ ملے کہ اس طرح چور دروازے سے آ کر عوام کی امنگوں، خواہشوں، حقوق،

اس نے بارود کی بدبودار آوازوں میں بھی کہا میں کمیونسٹ ہوں
مجھے مارو گے تو یہاں ایک نہیں، دو نہیں ہزاروں نذیر پیدا ہونگے

جذبات سے سالوں سال کھیلتے رہیں۔ اس لیے نذیر عباسی کی شہادت کی پکار اس امن اور شانتی کا دروازہ کھول کر دنیا کے محنت کشوں کو جوڑنے کی پکار ہے جو کسی بھی دیوار کسی بھی خاردار تاروں سے اس رشتے کو الگ نہ کر سکے۔ پاکستان اپنے پڑوسی ممالک بشمول انڈیا تعلقات کیلئے کوشاں ہے۔ جب اس ملک کے حکمران انڈیا کا دورہ کرتے ہیں وہاں پر اپنے آبائی گاؤں دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں لیتے ہیں تو اس مٹی سے ان کے بچپن کے احساسات یاد آتے ہیں۔ نذیر عباسی نے دنیا کے محنت کشوں کی بات کی۔ اس نے نظریہ اشتراکیت کی بات کی۔ اس نے سامراجی نظریے سے بغاوت کا اعلان کیا تو اسے غدار کہا گیا جب کہ ہم یوم مئی بڑے شان و شوکت سے مناتے ہیں۔ یہ ساری سازشیں سارے ہتھکنڈے اس لیے استعمال کیے گئے کہ اصل جدوجہد سے گمراہ کیا جائے۔

مگر نذیر عباسی کی شہادت تاریخ کے کٹہرے میں کھڑی تمام لینن اور انقلابی تنظیموں کو منظم کرنے کی آواز دے رہی ہے تا کہ اس کے نظریے اور جدوجہد کو آگے بڑھایا جائے۔ باضمیر عدالت میں نذیر انقلابی فاتح ہے مگر نذیر کے قاتلوں کو بے نقاب کرنے کے لیے عدالتی کمیشن قائم کیے جائیں تا کہ نذیر عباسی کی جدوجہد کے سرخ جھنڈے کا لہو میلا نہ ہو۔

☆☆☆

نذیر عباسی آج بھی اس انقلابی قافلے کی قیادت کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں

فوجی آمروں اور بورژوا جمہوری حکمرانوں کیلئے کمیونسٹ ہمیشہ خطرہ رہے ہیں

''کامریڈ نذیر عباسی کی شہادت یقیناً ایک بڑا سانحہ تھا مگر اس سے بھی بڑا واقعہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا بکھر جانا، تحلیل ہو جانا تھا'' (حمیدہ گھانگھرو)

نثار لغاری

نذیر عباسی کی گرفتاری

پاکستان بننے کے بعد عوامی سیاست اور خاص طور پر کمیونسٹ پارٹی وکمیونسٹ تحریک ایک ممنوع تحریک سمجھی گئی ہے۔ کمیونسٹوں پر خاص نظر کرم رہی ہے حکمران طبقات اور خصوصاً فوج اور خفیہ ایجنسیوں کی۔

ایوبی آمریت کے دور میں مجموعی طور پر سیاست کو ممنوع قرار دیا گیا اور کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان اس کے عوامی محاذوں پر پابندی عائد کر دی گئی، مگر تب بھی کمیونسٹ پارٹی نے فوجی آمریت کے خلاف تحریک جاری رکھی اور اس عمل کی پاداش میں حسن ناصر کو 1960ء میں شاہی قلعہ لاہور میں شہید کر دیا گیا۔ کئی ترقی پسند انقلابی کمیونسٹوں کو گرفتار کیا گیا۔ ہر قسم کے کمیونسٹ لٹریچر پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس سب کے باوجود جب بھی کمیونسٹوں کو موقع ملا، انہوں نے کمیونسٹ فریضے کو نبھاتے ہوئے عوام کی خوشحالی اور ایک عوامی جمہوری حکومت و بہتر معاشرے کے لیے کوششیں جاری رکھیں اور اس عمل کی پاداش میں ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کیں۔

ایوبی آمریت کے خاتمے کے بعد جس حد تک جمہوریت بحال ہوئی کمیونسٹوں نے اس کو خوش آمدید کہا اور عوام کو اپنے انقلابی پروگرام سے آگاہ کرنے کے لیے سرگرم رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا قیام ہوا یا اس سے پہلے بنگالیوں کا قتل عام، فوج کشی، بلوچستان آپریشن غرض ہر محاذ پر اس انقلابی تحریک نے اپنا فرض نبھایا۔ یہاں فوجی آمروں اور بورژوا جمہوری حکمرانوں کے لیے کمیونسٹ ہمیشہ خطرہ رہے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت میں بھی کمیونسٹ گرفتار رہے اور مزدور طبقے کی ہاریوں کی بات کرنے پر دشمن گردانے گئے۔

ضیائی آمریت میں ایک مرتبہ پھر جمہوریت پسند انقلابی اور کمیونسٹ سرگرم ہو گئے۔ اس مرتبہ کمیونسٹ قیادت میں ایک نوجوان بڑے مشہور ہوئے اور خفیہ ادارے پہلے ہی کئی تحریکوں میں اس کو جاننے لگے، وہ تھے کامریڈ نذیر عباسی! جو کمیونسٹ پارٹی کی سنٹرل کمیٹی میں سب سے چھوٹے تھے۔

ضیاء الحق کی سربراہی میں خفیہ فوجی ادارے آئی ایس آئی انٹر سروس انٹیلی جنس کے افسران کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کو کچلنے کا فیصلہ کیے ہوئے تھے اور ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ میں بریگیڈیئر (ر) امتیاز کو اس آپریشن کے لیے ذمہ داری دی گئی۔ بریگیڈیئر امتیاز نے ایک چارج شیٹ بنائی کہ کمیونسٹ پارٹی روس کی خفیہ ایجنسی کے جی بی (K.G.B) اور ہندوستان کے خفیہ اداروں کے لیے کام کر رہی ہے اور پاکستانی ریاست کے خلاف گھناؤنے جرم یعنی خطرناک سازش میں ملوث ہے۔ اسی الزام کو موجودہ دور میں بھی وہ دہرا رہے ہیں۔ حالیہ دنوں میں بریگیڈیئر (ر) امتیاز نے اے آر وائی ٹی وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ کمیونسٹ کے جی بی اور "راء" کے لیے کام کر رہے تھے اس لیے ان کے خلاف ہم نے آپریشن کیا۔ ایم آر ڈی تحریک کے پیچھے بھی ہندوستانی خفیہ ادارے (RAW) کا ہاتھ تھا۔

شہید نذیر عباسی اور اس کے دیگر ساتھیوں کو کراچی میں پیپلز کالونی میں ایک کوارٹر جو اس وقت کمیونسٹ پارٹی کا خفیہ دفتر تھا، سے 30 جون 1980ء کو گرفتار کیا گیا۔ سہیل سانگی، شبیر شبر، کمال وارثی، بدر ابڑو، پروفیسر جمال نقوی، گرفتار کیے گئے۔ ان کے حوالے سے یہ کہا گیا کہ ملک دشمن قوتوں کی ایک بڑی سازش ناکام بنائی گئی ہے۔

شبیر شبر جو اس وقت سکھر میں وکیل ہیں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ ماڑیپور میں ایک خفیہ فوجی سیل جو ملٹری انٹیلی جنس کے استعمال میں ایک بدنام زمانہ ٹارچر سیل تھا، وہاں ہمیں رکھا گیا۔ وہاں ایک فوجی اعلیٰ افسر ہم سے تفتیش کرنے آتا جو میجر (ر) امتیاز تھا۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا جب اخباروں میں ان کی تصاویر لگیں، اس ٹارچر سیل میں سبھی پر تشدد ہوتا ہے۔

کامریڈ نذیر عباسی کو خاص ٹارگٹ کیا گیا کیوں کہ وہ اس تحریک کے ایک سرگرم نوجوان کارکن و لیڈر تھے۔ پٹ فیڈر سے لیکر سندھ کے تعلیمی اداروں میں کئی ایک معرکوں میں وہ بڑی شہرت پا چکے تھے۔ کامریڈ کے ساتھیوں کے مطابق ان سے یہ پوچھا جاتا کہ کن کن ملکوں سے آپ فنڈ لیتے ہیں اور روس و انڈیا کے لیے کس کی معرفت کام کرتے ہیں۔ اپنے سبھی ساتھیوں کے نام اور کام بتائیں۔

کامریڈ نذیر عباسی کے جسم پر اتنا تشدد کیا گیا کہ ان کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ کامریڈ کی بیوہ حمیدہ گھانگھرو جو خود بھی کامریڈ اور انقلابی تھیں اور ایک اہم انقلابی سندھ ہاری کمیٹی کے رہنما ہاشم گھانگھرو کی بیٹی ہیں، نے بتایا کہ کامریڈ نذیر عباسی کو عبدالستار ایدھی نے غسل دیا اور ان کے بیان کے مطابق 12 بڑے زخم ان کے جسم پر تھے۔ عبدالستار ایدھی اپنی یہ بات بتا سکتے ہیں اگر ان سے پوچھا جائے۔

نذیر عباسی کیس

نذیر عباسی کو تشدد کر کے شہید کرنے کے بعد خفیہ طریقے سے عبدالستار ایدھی سے غسل دلوا کر سخی حسن قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ اس عمل میں نذیر کے بہنوئی کو لے جایا گیا۔ اس سارے معاملے کے خلاف پہلے ہی کامریڈ کی بیوہ حمیدہ سندھ ہائی کورٹ میں حبس بے جا کی درخواست ان ایجنسیوں کے خلاف دائر کروا چکی تھیں۔

کامریڈ کی شہادت کے بعد ایک ایف آئی آر عبدالودود اور اختر حسین ایڈووکیٹ کی معرفت عدالت کے ذریعے داخل کرائی گئی۔ اسی ایف آئی آر میں چیف مارشل

لا ایڈمنسٹریٹر وصدر پاکستان ضیاء الحق، گورنر سندھ و نمائندہ مارشل لاء ایس ایم عباسی اور آئی ایس آئی کے سندھ کے انچارج وآپریشن انچارج امتیاز (ر) بریگیڈیئر عرف ''بلا'' کو نذیر عباسی کے قتل میں نامزد کروایا گیا۔

کامریڈ حمیدہ گھانگھرو کا موقف

کامریڈ نذیر عباسی کی شہادت کے بعد کامریڈ حمیدہ ہی تھیں جن کو نذیر عباسی کی شہادت ہمیشہ یاد رہی۔ وہ سپریم کورٹ میں بھی چارہ جوئی کرتی رہیں اور اب بھی انہوں نے ایک مرتبہ پھر وکلاء سے مشورہ کرنا شروع کر دیا ہے اور سپریم کورٹ میں کیس کو ری اوپن کرنے کی درخواست دائر کر رہی ہیں۔ پہلے ایف آئی آر بھی انہی کی مدعیت میں داخل کی گئی تھی۔ ایک ذاتی ملاقات میں انہوں نے کہا کہ'' کامریڈ نذیر عباسی کی شہادت یقیناً ایک بڑا سانحہ تھا مگر اس سے بھی بڑا واقعہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا بکھر جانا، تحلیل ہو جانا تھا'' کامریڈ حمیدہ کا کہنا تھا کہ ایک طرف تو حکمران فوجی اہلکار نذیر کے قاتل تھے دوسرے وہ ساتھی جنہوں نے نذیر کی پارٹی کو تحلیل کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیشہ وہ تحریک مضبوط ہوتی ہے جس میں شہادتیں شامل ہو جائیں مگر یہ کیا ہوا کہ نذیر کی شہادت کے بعد کمیونسٹ پارٹی تحلیل کر دی گئی۔

کامریڈ حمیدہ گھانگھرو نے بتایا کہ بینظیر بھٹو کے پہلے دور میں انہوں نے خود مجھے اور کامریڈ کی بیٹی زرقا کو اسلام آباد بلوا کر یقین دلوایا تھا کہ اس کیس کو اوپن کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ خود بینظیر بھٹو نے اس ملاقات میں کہا کہ مجھے پتہ ہے کہ ''نذیر عباسی کی شہادت میں بریگیڈیئر امتیاز ملوث ہے''۔ مگر جلد ہی ان کی حکومت ختم کر دی گئی۔

بریگیڈیئر (ر) امتیاز میڈیا پر

ابھی 9 اگست آئی بھی نہ تھی کہ اس سال (ر) بریگیڈیئر امتیاز میڈیا پر آجاتے ہیں اور کئی قسم کے انکشافات کرتے ہیں۔ '' آئی جے آئی ہم نے بنوائی، سیاستدان کرپٹ ہیں، ہم سیاستدانوں کو 35,35 لاکھ دیا کرتے تھے''۔ یہ وہی بریگیڈیئر امتیاز تھے جس نے نذیر عباسی اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا اور نذیر عباسی پر تشدد کرتے ہوئے اسے شہید کر دیا۔

حال ہی میں اس سے جب پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ ساجد نامی فوجی اہلکار نے مجھے آکر بتایا تھا کہ نذیر عباسی دل کے دورے سے وفات پا گئے ہیں۔ کامریڈ حمیدہ گھانگھرو نے دوسرے دن ہی اس بیان کی تردید کی اور کہا کہ فوجی تحویل میں ان کی موت ہوئی اور پوسٹ مارٹم نہیں کروایا گیا۔ اس رپورٹ کو چھپایا گیا۔ اس طرح انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس ساجد نامی فوجی اہلکار کو گرفتار کیوں نہیں کیا گیا۔ بریگیڈیئر اس حوالے سے بالکل جھوٹا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بریگیڈیئر امتیاز کو گرفتار کیا جائے اور اس سے تحقیقات کروائی جائیں اور باقی لوگوں کے نام بھی وہی بتا سکتا ہے کہ اس نے کس کے کہنے پر نذیر عباسی کو شہید کیا۔

> کامریڈ نذیر عباسی کا کیس ری اوپن کروانا آج کی لڑائی بھی ہے کیوں کہ پاکستان اس وقت بھی انہی قوتوں کی سازشوں میں گھرا ہوا ہے جو نذیر عباسی کی قاتل ہیں

کمیونسٹوں کا ملک گیر احتجاج

کامریڈ نذیر عباسی کی شہادت کے 29 سال بعد پاکستان میں اور پاکستان سے باہر پہلی مرتبہ ملک گیر احتجاج ہوئے۔ اس حوالے سے 17 ستمبر 2009ء کو لیبر پارٹی پاکستان، کمیونسٹ پارٹی، کمیونسٹ مزدور کسان پارٹی، نیشنل ورکرز پارٹی اور عوامی پارٹی کی کال پر ملک کے کئی چھوٹے بڑے شہروں میں احتجاج ہوئے جن میں مطالبہ کیا گیا کہ نذیر عباسی کے کیس کو کھولا جائے اور اس میں ملوث اہلکاروں کو گرفتار کیا جائے خاص طور پر بریگیڈیئر امتیاز جس نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ کمیونسٹوں کے خلاف میں نے بھرپور آپریشن کیا، ان کی کمر توڑ دی۔ اس طرح اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ وہ اس تشدد وجبر میں شریک تھا۔

پاکستان کی تاریخ میں یہ بڑا احتجاج تھا جس نے انقلابیوں اور ان کے دشمنوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ پہلی مرتبہ کامریڈ نذیر عباسی کا کیس باقاعدہ عوامی سطح پر اٹھایا گیا ہے اور نئی نسل جو کامریڈ نذیر عباسی کے نام سے بھی ناواقف ہو چکی تھی پھر سے آشنا ہوئی ہے۔ نذیر عباسی آج بھی اس انقلابی قافلے کی قیادت کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

بریگیڈیئر امتیاز اور اس کے ساتھی موجودہ دور میں بھی جمہوریت اور سویلین حکومت کے خلاف سازشیں کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں اور اس وقت بریگیڈیئر امتیاز کا سرگرم ہونا بھی پرویز مشرف کو ٹرائل سے بچانے کے لیے ہے۔ نواز شریف کیوں کہ اس حوالے سے اسٹینڈ لے رہے تھے اور پرویز مشرف کے خلاف آرٹیکل 6 کے مطابق کارروائی کا مطالبہ کر رہے تھے اس لیے ان کو معتوب کرنا، ان کے پرانے کارنامے کھولنا اس سلسلے کی کڑی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سابق آرمی چیف کو بچایا جائے۔ اس سلسلے میں بھی اگر ہم دیکھیں تو بریگیڈیئر (ر) امتیاز اور اس کے ساتھیوں کو اس وقت بھی سویلین حکومت راس نہیں آرہی۔ وہ مختلف قسم کی سازشیں کر رہے ہیں اور کمیونسٹوں کا یہ فرض ہے کہ ان کو بے نقاب کریں۔

کامریڈ نذیر عباسی کا کیس ری اوپن کروانا آج کی لڑائی بھی ہے کیوں کہ پاکستان اس وقت بھی انہی قوتوں کی سازشوں میں گھرا ہوا ہے جو نذیر عباسی کی قاتل ہیں۔ وہی قاتل آج بھی سازشیں کر رہے ہیں، عالمی سامراج کے ایجنٹ بنے ہوئے ہیں۔ امریکی جارحیت، ملاشاہی، جاگیرداری، اس ہی طرح عوام کا استحصال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو یہ سب کچھ اسی طرح جاری ہے جو 29 سال پہلے تھا۔ نذیر عباسی کیس درحقیقت ان سبھی حالات پر ایک تنقید ہے اور اس سرخ پرچم کو ایک مرتبہ پھر بلند کرنے کی ضرورت ہے۔

نذیر عباسی کیس عوام کی عدالت میں

ملک گیر سطح پر نذیر عباسی کیس کو ری اوپن کرنے کے لیے ملک کی حقیقی انقلابی و جمہوری قوتوں نے عوام کے سامنے اپنا موقف پیش کرتے ہوئے یہ کیس عوامی عدالت میں بھی داخل کر دیا ہے۔ اب دیکھا جائے گا کہ ہم کتنی مضبوطی کیساتھ اس مسئلے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ کیس درحقیقت آمریت، فوجی راج، جاگیرداری، سرمایہ داری اور اس کی ایجنٹ سیاسی قوتوں پر بھی ہے۔

☆☆☆

جناب اسٹیشن ہاؤس آفیسر (S.H.O) صاحب!
ڈیفنس پولیس اسٹیشن
ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی

جنابِ عالی!

میں حمیدہ گھانگھرو بیوہ نذیر عباسی شہید ساکن شاہی بازار جہاب پور جنگشن ضلع نواب شاہ سندھ فریادی ہوں کہ میں نذیر عباسی شہید کی بیوہ ہوں۔ میرے شوہر ایک ترقی پسند طالبعلم تھے۔ وہ سندھ یونیورسٹی کے ایم اے سیاسیات کے طالبعلم تھے اور سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے مرکزی صدر اور مزدور کسان طالبعلم عوامی رابطہ کمیٹی سے منسلک تھے۔ اور پاکستان فیڈرل یونین آف اسٹوڈنٹس کے وائس چیئرمین تھے۔ وہ موجودہ فوجی آمریت کے خلاف تھے اور ملک میں ایسے نظام کے قیام کے متمنی تھے جو ہر قسم کے استحصال سے پاک ہو۔ میرے شوہر کے ان سیاسی خیالات کی وجہ سے فوجی حکمرانوں نے اپنی فیڈرل انویسٹیگیشن یونٹ سے انہیں گرفتار کیا تھا۔ اور کئی بار ان پر تشدد کیا تھا۔ اور یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر وہ اس تشدد کے بعد بھی سیاست میں حصہ لیں گے تو انہیں مار ڈالا جائیگا۔ ان حقائق پر مبنی انہوں نے سندھ ہائیکورٹ میں حلف نامہ بھی داخل کیا تھا۔

بتاریخ 30۔ جولائی 1980ء کو میرے شوہر نذیر عباسی کو پاکستان کوارٹرز میں انکے ایک دوست کے گھر سے گرفتار کیا تھا اور مارٹیپور ملٹری انویسٹیگیشن سینٹر لے جایا گیا۔ میرے شوہر کو F.I.U اور پولیس نے گرفتار کیا تھا۔ مارٹیپور انویسٹیگیشن سینٹر میں مسلسل اذیتیں دی جاتی رہیں۔ اور ظلم و تشدد اور بہیمانہ عمل کے نتیجے میں 9۔ اگست 1980ء کو نذیر عباسی کی موت واقع ہوگئی۔ یہ دیدہ دانستہ قتل جنرل ضیاء الحق اور گورنر ایس۔ ایم عباسی کی ہدایت پر فوجیوں نے کیا ہے کیونکہ جنرل ضیاء الحق نے ببانگ دہل اپنے جابرانہ ارادوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ وہ بائیں بازو کے لوگوں کو نہیں چھوڑیں گے اور انکو الٹا لٹکا دیں گے۔

جب مذکورہ بالا تشدد کے نتیجے میں میرے شوہر نذیر عباسی کی موت بتاریخ 9۔ اگست 1980ء بوقت دوپہر واقع ہوگئی تو انکی لاش کو سول ہسپتال کراچی لے جایا گیا۔ ڈیفنس پولیس اسٹیشن ... نے زیر دفعہ 174 ضابطہ فوجداری کے تحت کاروائی کی اور لاش سول ہسپتال کے مردہ خانے میں بھیج دی گئی۔ سول ہسپتال میں میرے شوہر نذیر عباسی شہید کا پوسٹ مارٹم ڈاکٹر مجید اور ڈاکٹر قیصر رسول سے کرایا گیا۔ جرم کی پردہ پوشی کے لئے میرے شوہر کی لاش کسی بھی رشتہ دار کے حوالے نہ کی گئی اور چونکہ اس جرم میں ملک کے اعلیٰ ترین حکام شامل ہیں۔ اسلئے صحیح اور درست پوسٹ مارٹم کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ جرم کے مزید پردہ پوشی کے لئے میرے شوہر کے دور کے رشتہ دار اپنی نذیر عباسی شہید کے بہنوئی کے بھائی کو جسکا نام ولی محمد ہے پولیس کی حراست میں مردہ خانے لے جاکر میرے شوہر کی نعش کی شناخت کرائی گئی اور اس دور کے رشتہ دار کے مطالبے کے باوجود میرے شوہر کی لاش انکے سپرد نہ کی گئی۔ اور جیل میں بند کرنے کی دھمکی دیکر زبردستی ولی محمد سے چند کاغذات پر دستخط کروا لئے گئے۔ اسکے بعد نہایت خفیہ طور پر پولیس نے ایک لاوارث کی طرح میرے شوہر کو ستار ایدھی سوشل ورکر کے ذریعے غسل کروایا اور کفن پہنایا گیا اور ستار ایدھی کے ساتھ پولیس نے میرے شوہر کی لاش تقریباً دو بجے سخی حسن قبرستان میں دفن کردیا۔

فریاد ہے کہ یہ قتل عمد جنرل ضیاء الحق اور جنرل ایس۔ ایم عباسی کے سوچے سمجھے منصوبے، انکے احکامات کے تحت کیا گیا ہے۔ اور فوجی اور F.I.U اور مارٹیپور تفتیشی مرکز کے اراکین شریک جرم ہیں۔ فریاد ہے کہ مذکورہ ملزمان کے خلاف قانون کے تحت کاروائی کی جائے۔

چونکہ مجھے اور میرے عزیزوں کو ہراساں اور پریشان کیا جارہا ہے۔ پولیس انہیں بے حد تنگ کر رہی ہے اس لئے ذاتی جانی خطرے کی بناء پر میں یہ رپورٹ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بنام SHO ڈیفنس پولیس اسٹیشن، S.P علاقہ اور D.I.G کراچی کو روانہ کر رہی ہوں۔

مورخہ 17۔ اگست 1980ء

(دستخط)
حمیدہ گھانگھرو
بیوہ نذیر عباسی شہید
ساکن شاہی بازار۔ محراب پور جنکشن۔

میں نے اور کمال وارثی نے امتیاز کا چہرہ دیکھا تھا

شبیر شر

تفتیشی پریڈ کروائی جائے تو سینکڑوں لوگ امتیاز (بلا) کو پہچان لینگے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ نذیر عباسی قتل کی نئے سرے سے تحقیقات کروائی جائے۔ یہ کیس شہید ذوالفقار علی بھٹو، شہید ناصر بلوچ، شہید ایاز سموں، ادریس طوطی اور رزاق جھرنا کے کیس سے بالکل مختلف ہے۔ اس لیے کہ ان پر جھوٹے الزامات لگا کر ہی صحیح مگر کورٹوں میں کیس چلائے گئے۔

نذیر عباسی پر نہ کسی کورٹ میں کیس چلایا گیا اور نہ کسی قتل، ڈاکے یا لوٹ مار کا کوئی الزام تھا، اگر اس پر الزامات ہوتے تو عدالت میں کیس چلا کر اس کی تحقیقات کروانے میں مشکلات ہوتیں۔ مگر اسے ایک معمولی پمفلٹ کیس میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس وقت جو آئی ایس آئی کا سربراہ لیفٹیننٹ کرنل امتیاز جو ریٹائرڈ بریگیڈیئر امتیاز (بلا) کے نام سے مشہور ہے ایشیاء کے ماڈل ڈکٹیٹر ضیاء الحق کے پاس نمبر بنانے کیلئے چار کمیونسٹوں کو گرفتار کر کے ڈرامہ رچایا کہ اس نے بڑی سازش پکڑی ہے۔

پاکستان کی بنیاد کو گرانے والے خطرناک مجرم گرفتار کیے ہیں جب کہ ان الزامات میں سے ایک بھی الزام ثابت کرنے سے پہلے 9 اگست کو نذیر عباسی، کمال وارثی، سہیل سانگی اور مجھ پر مسلسل تشدد کیا گیا۔ ہمیں ایک کھولی میں مکمل قید تنہائی میں رکھا گیا۔ موت کے سزا یافتہ قیدیوں کو بھی ایک گھنٹہ چہل قدمی کے لیے باہر نکالا جاتا ہے مگر ہمیں چوبیس گھنٹے بند رکھا گیا۔

امتیاز (بلا) نے الزام لگایا کہ ملک سے غداری، کے جی بی سے پیسے لیکر سوویت یونین کے مفادات کے لیے کام کرنے والے الزامات میں سے ایک بھی ثابت نہیں ہوا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ شہید نذیر عباسی شہید کے کیس کو 14 دن بعد زیر بحث لایا گیا۔ اس وقت پارٹی ختم ہو چکی تھی، اس کے ساتھی بڑے سرکاری عہدے لے کر بیٹھے تھے، کوئی بھی اس کا ساتھی یہ درخواست کرنے کے لیے تیار نہیں کہ نذیر عباسی کے قاتلوں پر کیس چلایا جائے اور سب کو ڈر ہے کہ ہماری نوکری نہ چلی جائے۔ نذیر عباسی کے سارے رشتے دار غیر سیاسی اور خوفزدہ ہیں کہ ایک تو مر گیا دوسرا بھی نہ چلا جائے۔ نذیر عباسی کی بیٹی موتیا بہت معصوم اور چھوٹی تھی۔ اسے ان ساری باتوں کا علم نہیں تھا۔ میں سمجھ رہا ہوں کے شہید نذیر عباسی کے کیس میں خاموش رہنے والے اس کے ساتھی اس کے ساتھ کیے ہوئے وچن اور وعدوں سے غداری کر رہے ہیں اور میں بھی ان میں شامل ہوں۔ میں بھی آج تک اپنے آپ سے لڑتا رہا ہوں؟ کہ کیوں آگے بڑھوں، میرے بچے چھوٹے ہیں میں نے ان کے لیے کیا کیا؟؟؟ موتیا کے لیے کوئی بھی نہیں ہے۔ جہاں تک بریگیڈیئر امتیاز کا تعلق ہے اس کے ثبوت موجود ہیں۔ جب اس کی تصویریں اخبار میں چھپیں تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہ شخص ہے جس کی قیادت میں ایک آئی ایس آئی کی ٹیم نے 29 جولائی 1980ء میں پیپلز کالونی سے ہمیں گرفتار کیا تھا۔ ہمیں گرفتار کر کے جب ایم پی اے ہاسٹل لے آئے، ایم پی اے ہاسٹل میں اس وقت فوجی عدالتیں اور ایس ایم ایل کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا تھا۔ کوئی کمرہ خالی کروانے کے لیے ہمیں آدھا گھنٹہ جیپ میں بیٹھنا پڑا۔ وہاں پر چار پانچ میجر ہمیں دیکھنے کے لیے آئے، ایک میجر کے پوچھنے پر ایک سادہ کپڑوں والے نے بتایا کہ یہ کرنل امتیاز کے مہمان ہیں۔ اس کے بعد اس ٹارچر کیمپ میں خود کھڑے ہو کر ہمیں تشدد کیا گیا، وہی وحشی درندہ نذیر عباسی کا قاتل ہے۔ اس پر کھلی عدالت میں کیس چلایا جائے۔ ہم بھی گواہی دینگے۔ میں اپنے لیے تو یقین سے کہہ رہا ہوں، باقیوں کے لیے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ نذیر عباسی کیس کی تحقیقات غیر جانبدارانہ بنیادوں پر کرائی جائے اور یہ تحقیقات ہائی کورٹ کے سنیئر ججز سے کرائی جائے۔

☆☆☆

میں سمجھ رہا ہوں کے شہید نذیر عباسی کے کیس میں خاموش رہنے والے اس کے ساتھی اس کے ساتھ کیے ہوئے وچن اور وعدوں سے غداری کر رہے ہیں اور میں بھی ان میں شامل ہوں۔ میں بھی آج تک اپنے آپ سے لڑتا رِہا ہوں؟ کہ کیوں آگے بڑھوں، میرے بچے چھوٹے ہیں میں نے ان کے لیے کیا کِیا؟؟؟ موتیا کے لیے کوئی بھی نہیں ہے

دل کے سپنے پر ڈائری کے چند بے ترتیب اکھر

احمد سلیم

فلسطینی حریت پسند لڑکی زرقا کی
نذیر قربانیوں سے بہت متاثر تھا اور ریاض
شاہد مرحوم کی فلم زرقا کئی بار دیکھ چکا تھا۔
چنانچہ بچی کا نام زرقا رکھا گیا

1990ء میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد سے پاکستان میں ایک نیا فیشن چل نکلا، کیونسٹوں کو برا بھلا کہنے کا۔

بین الاقوامی سطح پر خود سوویت یونین سب سے بڑا ''مجرم'' ٹھہرا اور پاکستان کی سطح پر کیمونسٹ پارٹی کو لعن طعن کا نشانہ بنایا جانے لگا اور آج تک بنایا جارہا ہے۔ یہ ترقی پسند سیاست کے دشمنوں کی طرف سے نہیں ہوا۔ بلکہ خود ترقی پسندوں میں سے کئی ایسے انتہا پسند نکل کر سامنے آئے جنہوں نے ہر خرابی کا منبع پاکستان کے کیمونسٹوں کو ٹھہرایا۔

دراصل یہ وہی لوگ تھے جو 1990ء سے پہلے سوویت یونین یا عالمی کیمونسٹ قیادت پر ذراسی تنقید کو بھی سامراجی سازش قرار دیتے تھے چنانچہ جب 1967ء میں، میں نے چیکوسلواکیہ پر سوویت چڑھائی کو غلط کہا اور لکھا۔

''پراگ میں آگ ہے''

تو ان لوگوں کو میری معصوم اور بے ضرر سی پنجابی نظم کے پیچھے ڈالروں کی جھنکار سنائی دی تھی اور پھر ان گناہگار آنکھوں نے دیکھا کہ 1990ء کے بعد وہی لوگ کہہ رہے تھے کہ سوویت یونین نے عالمی امن تباہ کر دیا تھا اور اپنے عوام پر ڈکٹیٹر شپ مسلط کر رکھی تھی۔ اب پرولتاری ڈکٹیٹر شپ میں سے پرولتاری کا لفظ نکل گیا تھا۔

نذیر عباسی کی بات کرنے سے پہلے اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان کی ترقی پسند تحریک کے ان منفی رجحانات کو نمایاں اور واضح کیا جائے جن کے مطابق نذیر عباسی سمیت تمام پاکستانی کیمونسٹ غلط تھے۔ وہ سوویت ڈکٹیٹر شپ کے آلہ کار تھے۔ یہ سب کچھ کہتے ہوئے قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد کی اس جدوجہد کو ان قربانیوں کو یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے جو پاکستان کے ترقی پسند سیاسی کارکن 1920ء سے آج تک دے رہے ہیں۔ ان میں نمایاں ترین دو نام شہید حسن ناصر اور شہید نذیر عباسی کے ہیں۔ ایک کو''لبرل'' ایوب خان نے اور دوسرے کو''اسلام پسند'' ضیاء الحق نے تشدد اور ایذا رسانی کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا لیکن کیا سچ مچ انہیں ختم کیا جاسکا؟ ظاہر ہے تاریخ نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا ہے۔

میں شہید حسن ناصر سے کبھی نہیں ملا بس اس کی باتیں سنی ہیں لیکن نذیر عباسی کی زندگی کے آخری دس برسوں کا میں گواہ بھی ہوں اور ان کا حصہ بھی رہا ہوں۔ میری سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میں نذیر کو کس پہلو سے یاد کروں اور کس پہلو کو نظر انداز کروں۔ میں اس کا ذکر حمیدہ گھانگھرو کے بغیر بھی نہیں کر سکتا۔ حمیدہ، زبیدہ اور فیض گھانگھرو کے بغیر بھی نہیں۔ اس فہرست میں شبیر شر، بدر ابڑو، جام ساقی اور کتنے ہی دوسرے ساتھیوں کے نام آتے ہیں لیکن آج نذیر کے بارے میں ذاتی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ لمحے، وہ دن، وہ مہینے اور سال جو میں نے نذیر عباسی کے ساتھ لاہور میں گزارے، جامشورو اور حیدر آباد میں گزارے، کراچی میں گزارے، میرے دل کے نہاں خانے میں ابھی تک دھڑک رہے ہیں اور اسی طرح زندہ ہیں، جیسے نذیر کی مسکراہٹ۔

تین ستمبر کے روزنامہ 'جنگ' میں ان پانچوں افراد کی تصاویر شائع ہوئیں جن کے نیچے یہ کیپشن لکھا تھا۔
''پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو ڈھانے اور ملک کی سلامتی کو نقصان پہنچانے کی سرگرمیوں میں مصروف ملک دشمنوں کے جس خفیہ سیل کا گزشتہ دنوں انکشاف ہوا، اس کے ارکان پروفیسر جمال الدین نقوی، احمد کمال وارثی، غلام شبیر شر اور سہیل سانگی''
نذیر عباسی کا نام لکھنے کی بجائے جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی

وہ فلمیں دیکھنے کے لئے بھی بھیس بدل لیتا۔ حمیدہ برقعہ پہنے اس کے ساتھ ہوتی، ایک دوبار گرفتار ہوتے ہوتے بچا

مجھے لاہور کی وہ شام اور گہری ہوتی رات کبھی نہیں بھولے گی۔ جب ہم نے لاہور میں ایک ساتھ فلم ''پاکیزہ'' دیکھی۔ میری اماں نے میری فرمائش کے بغیر نذیر اور حمیدہ کے لیے دعوت کا خاص اہتمام کیا تھا۔ مجھے ماں سے کبھی کچھ نہیں کہنا پڑتا تھا۔ وہ مجھ سے کم بات کرتی تھیں لیکن نذیر کو دیکھ کر چپکے سے بولی تھیں۔

''یہ تیرے جیسا پاگل لگتا ہے۔''

میں نے بھی ہنس کر کہا تھا

''مجھ سے بڑھ کر ماں۔ لیکن پاگل نہیں انقلابی'' اور ماں لفظ انقلابی پر دیر تک میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی تھی جیسے اسے اس لفظ کے خطرناک پہلو نے ڈرا دیا ہو۔ شاید اسے وہ پل یاد آ گئے تھے جب 1971ء میں لاہور کے پیپلز ہاؤس کی ایک فوجی عدالت میں اسے ایک میجر نے جو خود کو اس عدالت کا مجسٹریٹ کہتا تھا دھکا دیا تھا اور وہ بوڑھی، کمزور اور بیمار عورت عدالت کے فرش پر گر پڑی تھی۔

لاہور میں نذیر اور حمیدہ نے خوب انجوائے کیا۔

حمیدہ ایک بار پھر بہت ساری کتابیں پا کر خوش تھی اور نذیر اس نے تو مجھ سے پنجابی تک بولنے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ لاہور ہی کی ایک صبح میں اور نذیر پاکستانی انقلاب میں پنجاب کے کردار پر دیر تک بحث کرتے رہے تھے۔ پنجاب کے حوالے سے میرے تنقیدی ریمارکس سے اکتا کر اس نے اچانک کہا تھا۔

''کامریڈ! آپ بھی تو پنجابی ہو آپ کیسے۔۔۔؟'' میں نے اسے فوراً ٹوک دیا تھا۔

''نذیر! گٹر پر قالین بچھانے سے گٹر کی بدبو کو نہیں روکا جاسکتا۔ اس کے لیے اسے صاف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔''

اس نے محبت بھری مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''کامریڈ! آج سیاست سے ناشتہ کر لیا، اب شاعری کی سویٹ ڈش ہو جائے'' اور میں دیر تک اسے اپنی کڑوی کسیلی پنجابی نظمیں سناتا رہا تھا۔

نذیر اور حمیدہ بار بار جیل آتے اور جاتے رہتے تھے۔ ایک دہائی کے بعد ہم جامشورو میں ملے۔ شاید کسی اور معاملے پر اس کے دوبارہ وارنٹ نکلے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں کئی اور خوبیاں بھی تھیں۔ وہ ابھی زیر تعلیم تھا۔ بیروزگار تھا اور پارٹی کا ہول ٹائمر تھا۔ وہ پارٹی کے کئی انڈر گراؤنڈ کامریڈز سے میرے رابطے کا ذریعہ بھی تھا لیکن اس کی اپنی قید و بند کے باعث کئی بار خود اس سے ملاقات مشکل ہو جاتی۔ کئی بار تو یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ وہ کب گرفتار ہوا اور کب رہا ہوا ہے۔ رہائی کے بعد اسے اکثر انڈر گراؤنڈ رہنا پڑتا۔

کچھ عرصہ سے وہ حمیدہ کو پسند کرنے لگا تھا اور مجھ سے ایک دو بار اس کا اظہار بھی کر چکا تھا۔ ان کے درمیان باہمی پسندیدگی کا تعلق اس وقت استوار ہوا جب نذیر ڈیڑھ سال تک حیدرآباد جیل میں بند رہا تھا۔ 1978ء میں وہ جیل سے رہا ہوا اور جلد ہی دوبارہ اس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے لہٰذا اسے روپوش ہونا پڑا۔ اسی روپوشی کے دوران اس سے ایک بار ملاقات ہوئی تو اس کی آنکھوں میں خواب ہی خواب تھے اور اس کے ہونٹ ہی نہیں اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ میں نے اسے اپنی ایک نئی اردو نظم سنائی تو وہ کھل اٹھا شاید سارا وقت وہ حمیدہ کے بارے میں اور خود اپنے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ جب میں ان سطروں پر پہنچا تو اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور واہ واہ کرنے لگا۔

کچھ پتہ نہیں چلتا
شام رنگ لڑکی کے
لب پہ کون ہنستا ہے
دل میں کون روتا ہے
کچھ پتہ نہیں چلتا
کون صبح دم آکر
اس کے گرم ہاتھوں پر
اپنا ہاتھ دھرتا ہے
کون اس سے کرتا ہے
درد کی ملاقاتیں
اس پہ وار دیتا ہے
دل میں جاگتی راتیں
اور نیند میں اکثر
اس کا نام لیتا ہے
کون اتنا پاگل ہے؟

ہنسوڑ، کھلنڈرا اور انتہائی خوش مزاج ہونے کے باوجود نذیر رومانی مزاج کا نوجوان نہیں تھا اس لیے مجھے اس کے اس جذباتی انداز پر خاصی حیرت بھی ہوئی لیکن وہ انتہائی نرم دل، محبت کرنے والا اور خوبصورتی کا رسیا بھی تھا۔ جب میں نے نظم ختم کی تو اس نے کہا۔

''مگر وہ ایسی تو نہیں ہے''

''کون؟''

''حمیدہ''

میں ہنس پڑا اور کہا ''یہ نظم تو میں نے عائشہ کے بارے میں لکھی ہے'' وہ جھجک گیا اس اور یہ بھی نہ پوچھ سکا۔

'کون عائشہ؟'

چند دنوں بعد سنا، کامریڈ جام ساقی حمیدہ کے والد سے ملے، انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ فروری 1978ء کے پہلے ہفتے میں دونوں کی شادی طے ہو گئی اور وہ شادی سے صرف ایک رات پہلے چھپتا چھپاتا محراب پور پہنچا۔ حمیدہ نے بعد میں اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا کہ یہ شادی کم اور پارٹی کی کانفرنس زیادہ لگ رہی تھی۔ اسی روز زبیدہ کی شادی بھی انجام پائی۔ یہ تفصیل پڑھنے کے قابل ہے۔

یہ سندھ اور بلوچستان کے انتہائی ہنگامہ خیز دن تھے۔ پٹ فیڈر کے کسانوں پر ظلم وستم کا سلسلہ دراز ہوا تو حمیدہ اور پارٹی کے کئی ساتھی اس کے خلاف احتجاج میں پیش پیش تھے۔ شادی کے ایک ماہ بعد جامشورو میں 4 مارچ طلباء تحریک کا دن بڑے جوش وخروش سے منایا گیا۔ سندھ این ایس ایف، بی ایس او اور جیئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن نے خطاب کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جلسے کی صدارت کامریڈ جام ساقی کی تصویر نے کی۔

اسی رات بارہ بجے آصفہ رضوی، حمیدہ اور تین دوسرے ساتھی بذریعہ خیبر میل، حیدرآباد سے پٹ فیڈر کے لیے روانہ ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو جب سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے تو مارشل لا ریگولیشن 117 کے تحت پٹ فیڈر کے کسانوں کو زمینیں الاٹ کی گئی تھیں۔ ضیاء مارشل لا

نے اس حکم کو منسوخ کر دیا جسے بھٹو دور کی اسمبلی نے آئینی تحفظ دیا ہوا تھا۔ منسوخی کے بعد زمینداروں نے زمینیں ہتھیانے کے لیے کسانوں پر چڑھائی کر دی۔ وسط دسمبر 1977ء میں رئیس تاج محمد خان جمالی نے مسلح آدمیوں کے دو ٹرک اور ایک ٹریکٹر ٹرالی کے ساتھ پہلے غیر بلوچ کسانوں پر یلغار کی تا کہ انہیں بھگانے کے بعد بلوچ کسانوں سے نمٹا جا سکے۔ مقصد یہ تھا کہ بلوچ اور غیر بلوچ کسان متحد نہ ہونے پائیں۔ کسانوں نے رات بھر مزاحمت کی اور وڈیرے کو پسپا ہونا پڑا۔ 23 دسمبر کو مسلح زمینداروں نے پھر کسانوں پر حملہ کیا۔ جس میں سات کسان شہید ہو گئے۔ اسی پس منظر میں مارچ 1978ء میں حمیدہ سمیت پارٹی کے پانچ ساتھی ایک وفد کی صورت میں بلوچستان روانہ ہوئے۔ کامریڈ شمیم واسطی اور نذیر نے انہیں حیدر آباد ریلوے سٹیشن سے رخصت کیا۔ شہید آباد میں یہ سب ساتھی بھوک ہڑتال پر بیٹھے لیکن جلد ہی انہیں گرفتار کر کے مچ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ حمیدہ اور دوسرے ساتھی وہاں سے نکلے تو جیسے ایک اور یونیورسٹی گریجوایٹ کر کے نکلے ہوں۔

اپریل 1978ء میں میں لاہور گیا تو اماں کو نذیر اور حمیدہ کی شادی کا بتایا۔ سنتے ہی ماں کا چہرہ کھل اٹھا، کہنے لگیں۔ ''انہیں چند دن کے لیے بلا لو۔ مجھے اچھا لگے گا۔''

ماں کی بات سن کر مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔

''اماں! حمیدہ تو بلوچستان کی ایک جیل میں ہے اور نذیر؟ اس کے پاؤں میں مہندی لگی ہے اور وہ کہیں آنے جانے کے قابل نہیں ہے۔''

ماں کے چہرے پر یک لخت اداسی چھا گئی۔ بجھی ہوئی آواز میں بولیں۔

''تم سب کیا لوگ ہو؟''

''بس ایسے ہی ہیں اماں! آپ کے سب بچے''

مئی یا جون 1978ء میں حمیدہ رہا ہو کر محراب پور اپنے والدین کے گھر پہنچی تو اس سے دس دن قبل نذیر گرفتار ہو چکا تھا۔ یہ کیسی شادی خانہ آبادی تھی۔ نذیر کو کنڈہاری پولیس

دو بوڑھے انسان ایک ایسے بچے کے لیے تڑپ تڑپ کر رو رہے تھے جسے انہوں نے جنم نہیں دیا تھا۔

سٹیشن کی حوالات میں رکھا گیا تھا وہاں سے اسے نوشہرو فیروز سب جیل میں منتقل کیا گیا۔ اس دوران نذیر کے والد بیٹے کی گرفتاری کے صدمے میں چل بسے۔ حمیدہ نے وہیں اسے بابا کے انتقال کی خبر پہنچائی۔ پھر وہاں سے بھی اسے کسی خفیہ مقام پر منتقل کر دیا گیا جہاں سے پانچ ماہ بعد اسے کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ دیا گیا۔ وہ اسے بیس روپے بھی دے گئے۔ نذیر کی زبانی پتہ چلا کہ اسے بلوچستان کے قلی کیمپ میں رکھا گیا تھا۔

نذیر اور حمیدہ دونوں ٹنڈو الہ یار گئے۔ اس کے والد گزر چکے تھے۔ ماں اس کی جدائی میں تڑپ رہی تھی۔ انقلابی جوڑے نے اسے ایک دن عنایت کیا۔ واپس حیدر آباد پہنچے تو پھر پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع۔ نذیر کو پھر روپوش ہونا پڑا۔ وہ بھیس بدل کر کبھی کبھار حمیدہ کو ملنے آ جاتا۔ یہ تھا نو بیاہتا ہول ٹائمر جوڑے کا شادی کے بعد پہلا سال۔ وہ فلمیں دیکھنے کے لیے بھی بھیس بدل لیتا۔ حمیدہ برقعہ پہنے اس کے ساتھ ہوتی، ایک دو بار گرفتار ہوتے ہوتے بچا۔

دسمبر 1978ء میں جام ساقی کو گرفتار کر کے لاہور قلعے سمیت مختلف مقامات پر اذیتیں دی جا رہی تھیں۔ کئی بار یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ انہیں کہاں رکھا گیا ہے۔ جام ساقی کی رہائی کے لیے ملک بھر خصوصاً سندھ میں تحریک شدت پکڑ رہی تھی۔ پارٹی کی طرف سے دوسرے ساتھیوں سمیت حمیدہ اس تحریک میں پیش پیش تھی۔ کراچی کے ریگل چوک میں جام ساقی کی رہائی کیلئے بہت بڑا مظاہرہ ہوا جس میں حمیدہ نے بھی شرکت کی اور گرفتاری کے بعد سکھر جیل بھیج دی گئی۔ دو ماہ بعد اسے دوبارہ کراچی لایا گیا اور عدالت نے اسے رہا کر دیا۔ نذیر بدستور روپوش تھا۔

حمیدہ، کراچی سے سیدھی سکھر اپنی بہن زبیدہ کے پاس آ گئی جہاں کچھ عرصہ بعد اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ نذیر فلسطینی حریت پسند لڑکی زرقا کی قربانیوں سے بہت متاثر تھا اور ریاض شاہد مرحوم کی فلم زرقا کئی بار دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ بچی کا نام زرقا رکھا گیا۔ نذیر کبھی کبھار بھیس بدل کر ملنے آ جاتا۔

اب فیصلہ ہوا کہ کراچی میں گھر لے کر رہا جائے۔ وہ کراچی میں کرائے کا ایک گھر لے کر وہاں منتقل ہو گئے۔ اسے چند دن جی بھر کے اپنی بیٹی کیساتھ کھیلنا بھی نصیب نہ ہوا۔ ایک دن وہ گھر واپس نہ آیا۔ شام ہو گئی، رات ہو گئی، حمیدہ کو ایک کامریڈ کے گھر سے پتہ چلا کہ پیپلز کالونی والے گھر میں چھاپا پڑا ہے اور نذیر سمیت کئی ساتھی گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ خود حمیدہ ان کے چنگل میں آ گئی لیکن کسی ترکیب سے بچ نکلی۔ یہ غالباً یکم اگست 1980ء کا دن تھا۔ 8 اور 9 اگست کی درمیانی شب نذیر کو جسمانی طور پر ختم کر دیا گیا۔ یہ ساری تفصیل اب تاریخ کا حصہ ہے۔ اس سارے عرصے میں نذیر اور حمیدہ بار بار گرفتار ہوتے رہے تھے اس لیے ان سے ملاقات نہیں ہو پاتی تھی۔ جام ساقی کی رہائی کی تحریک کے دوران ایک بار حمیدہ کو دور سے دیکھا لیکن ملاقات کا موقع نہ ملا۔ اس عرصہ میں فروری 1979ء میں جام ساقی کی شریک حیات کی المناک موت بھی موضوع بحث بنی رہی تھی۔ پارٹی کے سیکرٹری جنرل کامریڈ امام علی نازش نے اس سلسلے میں جو بیان جاری کیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ان کی موت اس ذہنی اذیت سے ہوئی ہے جو کامریڈ جام ساقی پر فوجی تحویل میں جسمانی تشدد اور ان کی زندگی کو لاحق خطرے سے نہ صرف ان کے عزیز و اقارب بلکہ تمام جمہوریت پسندوں کو محسوس ہو رہی ہے۔

پارٹی رہنماؤں کی گرفتاریوں اور نذیر کی شہادت کو کئی ہفتوں تک چھپایا گیا۔ 30 اگست کے اخبارات میں آٹھ کالمی سرخیوں کے ساتھ یہ ڈرامائی انکشاف شائع ہوئے کہ پاکستان دشمن خفیہ سیل پکڑا گیا ہے۔ خفیہ سیل ملک کی نظریاتی بنیادوں اور سلامتی کو نقصان پہنچانے کے لیے کئی برسوں سے زیر زمین تخریبی مواد تیار اور تقسیم کر رہا تھا۔ سرمایہ غیر ملکی ذرائع سے حاصل ہو رہا تھا۔ ایک اور سرخی تھی۔ سیل کے سرکردہ افراد، غلام شبیر، احمد کمال، نذیر عباسی، پروفیسر نقوی اور سہیل سانگی گرفتار۔ حالانکہ کم و بیش تین ہفتے قبل حکومت نذیر عباسی کو شہید کر چکی تھی۔ تین ستمبر کے روزنامہ

'جنگ' میں ان پانچوں افراد کی تصاویر شائع ہوئیں جن کے نیچے یہ کیپشن لکھا تھا۔

"پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو ڈھانے اور ملک کی سلامتی کو نقصان پہنچانے کی سرگرمیوں میں مصروف ملک دشمنوں کے جس خفیہ سیل کا گزشتہ دنوں انکشاف ہوا، اس کے ارکان پروفیسر جمال الدین نقوی، احمد کمال وارثی، غلام شبیر شر اور سہیل سانگی"

نذیر عباسی کا نام لکھنے کی بجائے جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ فوجی حکومت تو دشمن تھی لیکن خود اس کی پارٹی نے کیا کیا۔ نذیر کے ساتھی، جو چند برس قید میں رہ کر رہا ہو گئے۔ ان میں سے ایک آدھ نے اپنی تنخواہیں وصول کرنے سمیت تمام سابقہ مراعات حاصل کیں۔ میرے سمیت، پارٹی کے بہت سے ساتھیوں کا بال بیکا تک نہ ہوا، وہ کہاں رہے اور انہوں نے شہید کی بیوہ اور بچی زرقا کیلئے کیا کیا۔ نذیر کی ماں اپنے بیٹے کے صدمے میں تڑپ تڑپ کر دل کا دورہ پڑنے سے دنیا سے ہی منہ موڑ گئی۔ اگر حمیدہ اور زرقا کے لفظوں میں تلخی اور کڑواہٹ ہے تو بلا جواز نہیں۔ پارٹی کے بیشتر ساتھی جو مارکسی نظریے سے ہی منحرف ہو گئے، انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ پارٹی کو تنقید کا نشانہ بنائیں لیکن حمیدہ اور زرقا کو یہ حق پہنچتا ہے۔ ان کی تنقید کو اسی سیاق وسباق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

میں اپنی بات کو یہیں روک دینا چاہتا ہوں۔ لیکن اس سے قبل میں شہیدوں کی ماؤں کو سلام کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے میں شہید حسن ناصر کی ماں کو سلام کرتا ہوں، جنہوں نے پاکستانی عوام کی نجات کے لیے اپنا جوان بیٹا قربان کر دیا۔ میں نذیر کی ماں کو سلام کرتا ہوں جو اس صدمے کے باعث گزر گئی کہ نذیر کی سانسیں بند ہونے سے پہلے اس کی اپنی سانسیں کیوں نہ بند ہو گئیں۔ میں حمیدہ کی ماں کو سلام کرتا ہوں جس نے ایسی بیٹی اور اس کے انقلابی بھائی بہنوں کو جنم دیا اور زندگی بھر کے دکھ اٹھانے میں خود اپنی ماں کے آگے سر جھکاتا ہوں جو 1964ء میں، 1971ء میں، 1975ء میں اور 1979ء میں چار مرتبہ اپنے بیٹے کو کھونے کے خوف سے گزری اور 1984ء میں کراچی کی سڑکوں پر پشتون اور مہاجر عوام کے بہتے ہوئے خون کا صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے اس دنیا سے گزر گئی۔ ہسپتال جاتے ہوئے ان کا سر میرے کندھے سے لگا ہوا تھا۔ ہسپتال پہنچے تو ان کے انتقال کو دس منٹ ہو چکے تھے۔ میں آج تک ان کی موت کے اس لمحے کو کھوج رہا ہوں جب انہوں نے آخری سانس لی۔ میں ایک اور وجہ سے بھی اپنی ماں کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔ نذیر کی شہادت کے ایک دو ماہ بعد میں لاہور آیا ہوا تھا ہم سب کھانا کھا رہے تھے۔ اچانک ماں نے پوچھا۔

"وہ تمہارا دوست نذیر خوش ہے نا؟"

نذیر اتنا کھلنڈرا تھا اور انہیں ہنساتا رہتا تھا کہ وہ ان کے دل سے نکل ہی نہیں پا رہا تھا۔ میرا نوالہ ہاتھ میں ہی رہ گیا اور میں اماں سے نظریں چرانے لگا۔ وہ پھر بولیں

"اور اس کی پیاری سی بیوی اس کے ساتھ خوش ہے نا؟"

میں نے آہستہ سے کہا، ہاں اماں، وہ بدستور لڑ رہی ہے۔ اچھے دنوں کیلئے جدوجہد کر رہی ہے اور خوش ہے لیکن نذیر اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔۔۔؟

"ہیں؟ اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ نہیں وہ ایسا تو نہیں تھا" میں نے نوالہ پھینک دیا اور چیخ کر کہا۔ وہ ایسا ہی تھا ماں، ایسا ہی تھا وہ، اور اٹھ کر تیز تیز قدموں سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ماں تڑپ کر میرے پیچھے آئی۔

"نہیں بیٹا! کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ وہ ایسا نہیں تھا۔ ہائے حمیدہ بچی"

میں نے بھیگی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا، ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا۔

"انہوں نے اسے مار ڈالا اماں"

ماں جیسے سکتے میں آ گئی، پھر آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ کمرے سے نکل گئی۔ وہ گھنٹوں خاموش رہی۔ اس رات بے چینی سے مجھے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ابا جی اور اماں اپنے اپنے بستر پر نہیں ہیں۔ میں چپکے سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں ماں ابا جی کے کندھے پر سر رکھے سسک سسک کر رو رہی تھی اور میرے ابا کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ دو بوڑھے انسان ایک ایسے بچے کے لیے تڑپ تڑپ کر رو رہے تھے جسے انہوں نے جنم نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

نذیر عباسی کی شہادت پر

کامریڈ رمضان میمن

کھلیں جب گل تو خاروں سے چھپائے جا نہیں سکتے
نہ ڈالو گل گلوں پر گل سجائے جا نہیں سکتے

جلا لو آگ میں ہم کو زمانہ دیکھ تو لے گا
کہ دیپک آگ پر رکھ کر بجھائے جا نہیں سکتے

زہر کے ایک پیالے سے نہ ہو گی بزم اب خالی
کہ پیاسے بن بلائے تو اٹھائے جا نہیں سکتے

چمن میں شور بوٹوں کے سناؤں کس طرح نغمے
کہ بن پائل کی دھن ہم سے سنائے جا نہیں سکتے

کفن میں ہی ذرا ان کو دکھا دیتے تو کیا ہوتا
ہنسے ہونگے وہ قاتل پر رلائے جا نہیں سکتے

رکی ہیں آئینوں پر کب تمہاری کم نظر نظریں
جھکا لو آئینے تم سے جھکائے جا نہیں سکتے

کھلیں جب گل تو خاروں سے چھپائے جا نہیں سکتے
نہ ڈالو گل گلوں پر گل سجائے جا نہیں سکتے

☆

نثار شاہ

بلاشبہ تاریخ اپنا انتقام خود لیتی ہے

بریگیڈیئر امتیاز کے موجودہ انکشاف ظاہر کرتے ہیں کہ پاکستان میں قانون صرف مظلوم کیلئے ہے اور ظالم ہر طرح کے جرائم سے مبرا ہے

انسانی سماج کے ارتقا کی پوری تاریخ ظالم اور مظلوم طبقات کے درمیان جاری کشمکش کی تاریخ ہے۔ پوری دنیا میں جہاں ظلم، ناانصافی اور طبقاتی تفریق کی بنیاد پر فائدے حاصل کرنے والے کردار پائے جاتے ہیں وہیں ظلم، ناانصافی اور طبقاتی جبر کے خلاف لڑنے والوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ شاید انسانی تاریخ میں انسان کی فلاح و بہبود اور حقوق کے تحفظ کے حوالے سے جو تھوڑی بہت ترقی ہوئی ہے وہ انہی انقلابیوں کی دین ہے جنہوں نے حق، سچائی، انصاف اور ظلم کے خلاف ہر دور کے فرعونوں کے سامنے اپنے سرنگوں کرنے کی بجائے پوری طاقت اور قوت کے ساتھ آواز حق اور سچ کا علم بلند رکھا ہے۔ انہیں اپنی جانوں کے نذرانے بھی دینے پڑے ہیں۔

انسانی تاریخ میں سقراط وہ کردار تھا جس نے زہر کا پیالہ تو پی لیا لیکن ظالم حکمران کے سامنے شکست تسلیم کرنا گوارہ نہ کیا۔ اسی طرح اس کے بعد بھی انسانی تاریخ میں ایسے بے شمار انقلابی ملتے ہیں جنہوں نے پھانسی کے پھندوں، جیل کی کال کوٹھڑیوں میں تشدد یا میدان جنگ میں گوریلا جدوجہد کرتے ہوئے موت کو گلے لگا لیا لیکن اپنے مشن کو جاری رکھا۔

سندھ سے تعلق رکھنے والے عظیم کمیونسٹ انقلابی رہنما نذیر عباسی بھی انہی انقلابیوں کی مالا کا ایک موتی تھے جنہوں نے موت کو گلے لگایا لیکن اپنے نظریے کو مقدم رکھا۔ نذیر عباسی شہید کا نام پاکستان کی کمیونسٹ تحریک میں بلاشبہ سب کیلئے مینارۂ نور ہے، انہوں نے پاکستان کی کمیونسٹ تحریک میں حسن ناصر جیسے انقلابیوں کی جدوجہد کی عظیم روایت کو زندہ رکھتے ہوئے نا صرف سوشلسٹ نظریات کو مظلوم طبقات میں پروان چڑھایا بلکہ ظالم و جابر ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق کے سامنے کلمۂ حق کو بلند کرتے ہوئے جان کی قربانی دے دی۔

نذیر عباسی کوئی ایک شخص نہ تھا جس کے مرنے کے کچھ عرصے بعد لوگ اسے بھول جاتے بلکہ نذیر عباسی مجسمۂ نور بغاوت، ایک نظریہ اور ایک عملی تحریک کا نام تھا جو اس کی موت کے نتیجے میں کمزور ہونے کے بجائے مزید طاقتور ہوئی ہے۔ آج اس کی موت کی عظیم قربانی کا ہی نتیجہ ہے کہ پاکستان کی تمام سوشلسٹ اور ترقی پسند نظریات کی حامل تنظیمیں یک زبان ہو کر نذیر عباسی کو شہید کرنے والے جنرل ضیاء الحق کے پلے بریگیڈیئر امتیاز اور دوسرے گھناؤنے کرداروں کی گرفتاری کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ 29 سال گزرنے کے بعد بھی بائیں بازو کی تمام ترقی پسند اور سوشلسٹ پارٹیوں کی طرف سے کیس کو دوبارہ سامنے لانے کا مطالبہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ حق اور سچ کے لیے دی جانے والی قربانی کبھی بھی رائیگاں نہیں جا سکتی۔

پاکستان کی کمیونسٹ و سوشلسٹ تحریک کی جڑوں میں نذیر عباسی، حسن ناصر، دادا امیر حیدر اور ان جیسے ہزاروں گم نام انقلابیوں کا لہو شامل ہے جو کبھی بھی رائیگاں نہیں جائے گا بلکہ ان کے اس لہو کا خراج ہی ہے کہ تمام بائیں بازو کی سیاسی پارٹیاں بلاتفریق یک زبان ہو کر نہ صرف ان کی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کر رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے لیے راہ مستقیم سمجھتے ہوئے باہمی یکجہتی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ آج اگر ان تمام انقلابیوں کی جدوجہد کو سراہنا ہے تو یقیناً اس کا بہترین طریقہ ان کی جدوجہد اور نظریات کو مظلوم طبقات تک پہنچا کر ایک مضبوط انقلابی تحریک تعمیر کرنا ہے جو بلاشبہ پاکستان کے مظلوم عوام کا روشن مستقبل ثابت ہو سکتی ہے۔ پاکستان کی 60 سالہ تاریخ میں نصف سے بھی زیادہ عرصے تک فوجی آمریت رہی اور ہر دور کا فوجی آمر جمہوریت کا قتل کرتا رہا۔ آج ساٹھ سال کے بعد ملک میں ایک مرتبہ بھی وکلاء اور سول سوسائٹی کی مثالی جدوجہد کی وجہ سے جمہوری ادارے کام کرنا شروع ہوئے ہیں اور پرویز مشرف کی لمبے عرصے کی آمریت کا اختتام ہوا ہے۔ موجود حکمران جہاں یہ دعوے کرتے رہے کہ وہ جمہوریت کے سب سے زیادہ حامی ہیں وہاں ان کا کردار ان دعووں کی سچائی کو ثابت کرنے میں ناکام نظر آتا ہے کیونکہ ایسی جمہوری حکومت جو ملک کے آئین کی دھجیاں اڑانے والے ڈکٹیٹر کو کچھ نہ کہہ سکے، جو سیاسی کارکنوں پر آمریت کے دور میں ہونے والے مظالم کے ملزموں کو کیفر کردار تک نہ پہنچا سکے وہ یقیناً ایک ناممکن اور لولی لنگڑی جمہوریت تو کہلا سکتی ہے عوامی جمہوریت نہیں۔ بریگیڈیئر امتیاز جیسے گھناؤنے کردار سرعام اپنے جرائم کا اقبال جرم کرتے ہوئے فخر سے کہتے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف جمہوریت پسندوں کو قتل کیا بلکہ سیاستدانوں کو تقسیم کیا اور ان کی وفاداریوں کی قیمت لگائی۔ بریگیڈیئر امتیاز کے موجودہ انکشاف ظاہر کرتے ہیں کہ پاکستان میں قانون صرف مظلوم کیلئے ہے اور ظالم ہر طرح کے جرائم سے مبرا ہے۔ یعنی پاکستانی ریاست کے تمام تر مسائل کا ذمہ دار صرف سیاست دان طبقہ نہیں بلکہ فوجی آمریت کی گود میں پلنے والا وہ مخصوص گروہ ہے جس نے ہر دور میں جمہوریت، انسانی آزادیوں اور منصفانہ سماج کیلئے اٹھنے والی حق و سچ کی آوازوں کو ہمیشہ کیلئے دبا دینے کی کوشش کی بلاشبہ تاریخ اپنا انتقام خود لیتی ہے اور اب وہ وقت بھی دور نہیں جب ان افراد کو بھی تاریخ کے انتقام کا سامنا کرنا پڑے گا۔

نذیر عباسی شہید کی پارٹنر حمیدہ گھانگھرو کی طرف سے ان کے کیس کی دوبارہ تحقیق کے مطالبہ اور پورے پاکستان میں سوشلسٹ اور ترقی پسند تنظیموں کی طرف سے کیے جانے والے مظاہروں نے نہ صرف نذیر عباسی کی شہادت کے مسئلے کو دوبارہ زندہ کر دیا ہے بلکہ بریگیڈیئر امتیاز کے گلے کی طرف بڑھنے والے پھندے کو اس کے مزید قریب کر دیا ہے۔ بائیں بازو کی پارٹیوں کی طرف سے اجلاسوں کا انعقاد اور مظاہروں کا آغاز رکے گا نہیں بلکہ یہ تحریک مزید طاقتور ہوگی۔ 17 ستمبر کو ہونے والے مظاہرے ملک گیر سطح پر کیے گئے۔ یہ یقیناً اس تحریک کے آغاز کے سلسلے میں ایک اچھی پیش رفت ہے۔ جمہوریت کی دعوت دار موجودہ حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بینظیر بھٹو، مرتضیٰ بھٹو، حسن ناصر اور نذیر عباسی سمیت تمام سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کے قاتلوں کی نشاندہی کر کے انہیں اپنے منطقی انجام تک پہنچائے تاکہ مستقبل میں جمہوریت دشمن عناصر کی حوصلہ شکنی ہو۔ ☆☆☆

شہید نذیر عباسی اور کمیونسٹ پارٹی

درحقیقت کمیونسٹ پارٹی نذیر عباسی کی شہادت سے ہی ٹوٹنا شروع ہوگئی تھی

سہیل بھٹی سکھر

ایک بھیانک اور تباہ کن حقیقت یہ بھی ہے کہ اقلیت ہمیشہ اکثریت پر حکمرانی کرتی ہے۔ اس حقیقت سے کوئی اتفاق کرے یا نہ! جو حال ہی میں سندھ کے ایک ہونہار سیاستدان کو اس کے الٹ رائے کر تقویت بخشنے کے لیے بہت سارے کاغذات کو سیاہ کرنا پڑا۔ مگر صرف سندھ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہی یہ حقیقت ہر شخص پر عیاں ہو سکتی ہے۔ ایرانی ہو یا یونانی، عرب ہوں یا افغانی، ارغون ہوں یا ترخان یا پھر انگریز، سندھ ہمیشہ مخصوص اقلیت کے ہاتھوں لوٹ کھسوٹ کا شکار رہا ہے۔ آج بھی سندھ کے موجودہ حالات پر نظر ڈالیں گے تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ تقسیم کے بعد جس اقلیت کو دل میں جگہ دی وہی آج اکثریتی سندھیوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ سندھ اور سندھیوں پر صدیوں سے مشتمل اس درد کے سفر کے دوران سندھ ڈاکوؤں اور لٹیروں سے لڑ کر مقابلہ کرتا رہا ہے۔ بہت سارے بہادروں نے سندھ کی مٹی کو ماتھے پر سجا کر خوشی خوشی اپنے سر قربان کر کے اپنی زندگی قربان کر کے اپنے سرخ لہو سے اس دھرتی کو سیراب کیا۔

شہید نذیر عباسی بھی انہی کرداروں میں سے ہے۔ شہید نذیر عباسی بچپن سے ہی میرے لیے مثالی کردار ادا کر رہا ہے۔ جس وقت نذیر عباسی کو کسی ٹارچر سیل میں اذیتیں دے کر شہید کیا تھا اس وقت میں پانچ سال کا تھا۔ اتنی عمر میں نذیر عباسی کی شہادت میرے لیے کوئی معنی خیز نہیں تھی۔ مگر کچھ سالوں کے بعد جب مختلف اخبارات اور رسالوں میں نذیر عباسی کی اذیت ناک شہادت کے متعلق پڑھا تو اس کے لیے میرے ذہن میں ایک تصور ابھرا اور اس کے لیے عظمت کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اس کے متعلق زیادہ معلومات کا تجسس بڑھتا گیا۔ ایک احساس جو میرے لیے غمزدہ ہے اور شاید زندگی بھر غمزدہ رہے کہ سندھ کے قریبی تاریخ کے دو عظیم شہید، شہید فاضل راہو اور شہید نذیر عباسی کو آمنے سامنے نہ دیکھ سکا نہ سن سکا۔ حال ہی میں کچھ مہینے پہلے شہید کی جیون ساتھی اور اس کے دکھ سکھ میں ساتھ دینے والی ادی حمیدہ گھانگھرو سکھر آئی تو شہید کے متعلق جاننے کی خواہش جاگ پڑی۔ سندھ کی سیاسی جدوجہد میں ادی حمیدہ گھانگھرو سکھر آئی تو شہید کے متعلق جاننے کی خواہش جاگ پڑی۔ سندھ کی سیاسی جدوجہد میں ادی حمیدہ نے بھی اپنا تاریخی کردار نبھایا ہے اور آج بھی اپنے فکر اور فلسفے میں پختہ یقین رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت سارے تاریخی واقعات کی آنکھوں دیکھی گواہ بھی ہے۔ اپنی تاریخ کو سمیٹنے میں ایسے تاریخی کردار بھی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے دوست اسد اعوان سے مل کر ادی حمیدہ سے ملاقات کی۔ جہاں تقریباً تین گھنٹے گرما گرم اور نظریاتی کشمکش سے بھرپور مباحثہ ہوا۔ طبقاتی جدوجہد، قومی جدوجہد، سوشلزم، ملائیت، این جی او کا سیاسی کردار، نذیر عباسی کی شہادت، قربانی، دوستوں کی بے وفائی، نذیر کی شہادت کے بعد کے حالات، نذیر کے گھر والوں کے دکھ درد اور نام نہاد پناہ گیر، ترقی پسندوں کی غداریاں ہماری بحث کا موضوع رہیں۔ باوجود اس کے کہ اس ساری بحث میں ہم کسی بھی بات پر متفق نہ ہو سکے اور نہ ہی میں یہ دعویٰ کروں گا کہ ہم صحیح تھے یا ادی حمیدہ! کیوں کہ یہ فیصلہ تو تاریخ ہی کرے گی۔ مگر میں ذاتی طور پر اس ساری بحث کے دوران ادی حمیدہ کی ثابت قدمی اور اپنے فکر اور فلسفے کا بھرپور اظہار کرنے سے بہت متاثر ہوا۔

خصوصاً نذیر کی شہادت کے بعد جب شہید کے سارے ساتھی آنکھیں بند کر کے تحریک کو آگے بڑھانے کی بجائے پیچھے ہٹ گئے۔ اس وقت ادی حمیدہ نے اکیلے طور پر جس بردباری سے جنرل ضیاء الحق جیسے جلاد ڈکٹیٹر سے مقابلہ کیا اس عمل نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ ادی حمیدہ کی باتوں سے یہ بھی نتیجہ نکالا کہ نذیر کی شہادت میں لانگ بوٹ والے فوجیوں کا ہاتھ تو تھا ہی مگر اسے شہید کرانے میں اسی کے ساتھی بھی حصہ دار تھے جنہوں نے اپنا گناہ بخشوانے کے لیے سارا قصور نذیر عباسی پر ڈال دیا اور اسے گرفتار کرانے میں لانگ بوٹوں کیساتھ مخبری کی۔

> نذیر عباسی اپنے مقصد کے حاصلات کے لیے جان جوکھم میں ڈالنے سے ذرا برابر بھی نہ گھبرایا۔ اپنی انفرادی خواہشوں کو عوام کی اجتماعی خواہشوں پر قربان کر دیا اور خوشی سے موت کو گلے لگایا۔ کن کی خاطر؟ ان رہنماؤں کی خاطر جن کو وہ انقلاب کا دروازہ سمجھتا تھا جنہوں نے اس کی موت کے بعد اپنی راہیں تبدیل کر لیں۔ ان گھبرائے ہوئے حیران پریشان اور خوف میں مبتلا لوگوں کے لیے جو اس کے المناک موت پر سراپائے احتجاج بھی نہ بنے

کنهن دوستن کنهن دشمن، هو چغلي کائي آيو آ،
ءِ ڀي تي ڳورو ڳٽ وجهي، هن پنهنجو پاڻ بچايو آ،

(ایاز)

نذیر عباسی کو جس بے رحمی سے اذیتیں دے کر شہید کیا گیا بعد میں قاتلوں اور جلادوں نے جس مجرمانہ طریقے سے رات کے اندھیرے میں قیدی کا کفن دے کر دفن کروایا۔ اس کی نعش ورثاء کے حوالے کرنا تو دور کی بات مگر اطلاع کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ اس المناک واقعے پر مجھے یونانی زبان میں لکھا ایک عظیم المیہ یاد آ رہا ہے۔ ایک لڑکی کے بھائی کو بغاوت کے جرم میں موت کی سزا سنائی جاتی ہے، جب لڑکی کو اطلاع دی جاتی ہے تو اس کے بھائی کی لاش کسی ویران جگہ پر وحشی جانوروں کی خوراک بنانے کے لیے رکھی گئی ہے اس کی لاش کو دفنانے کے لیے منع کیا گیا ہے اور اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف موت کی سزا مقرر کی گئی ہے تو وہ دکھ اور درد سے تڑپ اٹھتی ہے اور طے کرتی ہے کہ اس حکم کی خلاف ورزی کرنا میرا فرض ہے۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ اس خطرناک ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں اس کی بڑی بہن بھی مدد کرنے سے انکار کرتی ہے اور اسے اس کام سے روکنے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ ایک اٹل ارادے سے اپنے بھائی کی لاش کو دفنانے کے لیے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ دوسرے دن جب وقت کے بادشاہ کو سپاہی اطلاع دیتے ہیں کہ سرکاری اعلان اور سرکاری پہرے کے باوجود لاش کو دفنا دیا گیا ہے تو بادشاہ اپنی اس توہین پر غصہ کر کے مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کا حکم جاری کرتا ہے۔ یہ یونانی المیہ شہید نذیر عباسی کی شہادت سے بہت یکسانیت رکھتا ہے اور عوام میں اعتماد اور یقین رکھتا ہے۔

جي تون وڙهندي ماريو ويندين، هن ڌرتيءَ تان واريو ويندين

دردا تنهنجو ساهه ته ويندو، ماڻهوءَ جو ويساهه ويندو

(ایاز)

میری نظر میں نذیر عباسی ایک انتہا پسند سوشلسٹ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اکثر ترقی پسند ساتھی لفظ ''انتہا پسند'' کو اچھا نہ سمجھتے ہوں اس لیے کہ ان کی نظر میں انتہا پسندی ایک انقلاب دشمن رجحان ہے لیکن میرے خیال میں ہمارے پاس خواہ مخواہ بھی انتہا پسندی کو خوار اور خراب کیا گیا ہے۔ دراصل آج کے دور میں قوم پرستی، ترقی پسندی، انتہا پسندی، رجعت پرستی، بنیاد پرستی جیسے سیاسی اصلاحات کی نئی تشریح بیان اور پیش کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ جس حد تک وقت کے ساتھ تبدیل ہونے والی سماجی قدر کو اپنانے یا رد کرنے کا سوال ہے تو وہیں پر انتہا پسندی کا راستہ روکنا بھی لازم ہو جاتا ہے مگر کسی غیر معمولی اور عظیم کام کو سرانجام دینے کے لیے انتہا پسندی سے کام لینا ممکن ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی عظیم کارنامہ اس وقت تک تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا جب تک آپ کی اس کام سے اس درجہ کی وابستگی نہ ہو گی بلکہ ایسی کیفیت میں مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو سکتا ہے جس حد تک چیزوں کی گہرائیوں تک نہیں جائیں گے تب تک ان کی حقیقتوں کو معلوم نہیں کر سکیں گے۔ کسی پہاڑ کے سائے میں بیٹھ کر آپ پہاڑ کے سائے میں کھڑے ہو کر پہاڑ کی بلندی سے کسی وجود کی موجودگی کو نہیں جان سکتے یا دریا کے کنارے پر کھڑے ہو کر دریا کی گہرائی کو نہیں ناپ سکتے۔

آئرش فلاسفر جارج برکلے نے تو خود کو موت کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے پھانسی کے پھندے میں لٹکا دیا۔ اگر اس کے دوست اس وقت اسے بچا نہ سکتے تو ہم اس عظیم ہستی کے فکر اور فلسفے سے محروم ہو جاتے۔ بالکل اسی طرح نذیر عباسی اپنے مقصد کے حاصلات کے لیے جان جوکھم میں ڈالنے سے ذرا برابر بھی نہ گھبرایا۔ اپنی انفرادی خواہشوں کو عوام کی اجتماعی خواہشوں پر قربان کر دیا اور خوشی سے موت کو گلے لگایا۔ کن کی خاطر؟ ان رہنماؤں کی خاطر جن کو وہ انقلاب کا دروازہ سمجھتا تھا جنہوں نے اس کی موت کے بعد اپنی راہیں تبدیل کر لیں۔ ان گھبرائے ہوئے حیران پریشان اور خوف میں مبتلا لوگوں کے لیے جو اس کے المناک موت پر سراپائے احتجاج بھی نہ بنے۔ یہ شہید کے اپنے نظریہ اور مقصد سے انتہا درجہ کی وابستگی نہیں ہے؟ نذیر جیسے سرپھرے ہی ایسے مشکل کام کر سکتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سیاسی راہنما کی شہادت کے بعد اس کی پارٹی میں زیادہ جوش اور ولولہ پیدا ہونے کے بجائے ان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ شہیدوں کی قربانی سے عام لوگ اور اس کی پارٹی کے سیاسی کارکن میں تو ہمت پیدا ہوتی ہے مگر ان کے رہنما بزدل اور مایوس ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذوالفقار بھٹو کی شہادت پر اس کی پارٹی کے دوسرے رہنما وفاداریاں تبدیل کر گئے یا پھر ملک سے باہر چلے گئے۔ اس کی شہادت پر عوام تو سراپا احتجاج تھے مگر رہنما ڈھونڈنے سے بھی نہ مل رہے تھے۔ اسی طرح فاضل راہو کی شہادت کے بعد عوامی تحریک بھی کمزور پڑ گئی اور کچھ ہی سالوں میں ایک بڑا اور مضبوط حلقہ عوامی تحریک کو الوداع کر گیا جو خلا آج تک نہیں بھر سکا ہے۔ اسی طرح نذیر عباسی کی شہادت کے وقت بھی کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ایسا ہی حشر ہوا حالانکہ اس وقت اسکرین پر کمیونسٹ پارٹی کے رہنما بظاہر اور تھے پر نذیر عباسی کی شہادت کے بعد پارٹی جو تتر بتر ہو گئی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پارٹی کی سرگرمیوں کا جو محور تھا در حقیقت نذیر عباسی ہی تھا۔

آج شہید نذیر عباسی کے نام نہاد رہنما یا تو عوام دشمن اسٹیبلشمنٹ کے پرزے بن گئے ہیں جن کیساتھ رہ کر نذیر عباسی نے شہادت کا راستہ اپنایا۔ تو کچھ این جی او کے آلہ کار بن کر سرمایہ داری کی جے جے کار کر رہے ہیں۔ آج جب شہید کے نام پر رہنما جمال نقوی (جس نے نذیر عباسی کو فوجی آمروں کے آگے زبان نہ کھولنے کی تلقین کی تھی) کھلے عام سامراج اور آمروں کا ہمدرد بن کر سرمایہ داری نظام کے حق میں گیت گا رہا ہے۔ تو یقین کیساتھ کہہ رہا ہوں کہ شہید کی روح بھی تڑپ اٹھی ہو گی۔ سچ تو یہ ہے کہ نذیر عباسی ایک سچا اور کھرا آدرشی انسان تھا اس نے جو بھی خواب دیکھے اپنے لیے نہیں مگر اس دھرتی اور آنے والی نسلوں کی بہتری اور فائدے کیلئے دیکھے۔

جنهن وقت نه هوندس آءٌ تنهن، تون منهنجو قلر سيحائيندين،

پر پوءِ بہ دعا آمنهنجي، تون سک آزاديءَ جو ماڻيندين

ہمارے پاس یہ تاثر پایا گیا ہے کہ یہاں پر کمیونسٹ پارٹی کے بوریا بستر باندھنے کی شروعات سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد شروع ہوئی۔ مگر در حقیقت کمیونسٹ پارٹی نذیر عباسی کی شہادت سے ہی ٹوٹنا شروع ہو گئی تھی اور مختلف دھڑوں میں بٹتی گئی۔ میں کمیونسٹ پارٹی کے لیے لفظ ''زوال'' استعمال نہیں کروں گا کیونکہ پاکستان کے اندر کمیونسٹ پارٹی کبھی بلندی پر پہنچ ہی نہیں سکی تھی تو اس کا زوال کہاں سے ہو گا۔ ہاں البتہ نذیر عباسی جیسے بہادر، دلیر، انقلابیوں نے یہ کوشش ضرور کی تھی کہ کمیونسٹ پارٹی کو عوامی پارٹی بنانا چاہیے۔ مگر اس کے مصلحت پسند اور عقل سے محروم رہنماؤں نے ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ آخر کون سی وجوہات تھیں جو کمیونسٹ پارٹی اپنے پیر نہ جما سکی ہے اور نہ ہی لوگوں کے دلوں میں اپنے لیے کوئی مثبت رائے تشکیل دے سکی ہے۔ اس سوال کو ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے اس کے کئی اسباب ہیں اور ہر وجہ بحث طلب ہے۔

مگر دو بنیادی اسباب یہاں مختصراً ضرور بیان کرونگا ایک وہ کہ کمیونسٹ پارٹی کے اعلیٰ کار سوشلزم کو یہاں کی زمینی حقیقتوں سے سلجھانے کے بجائے سوویت یونین کی اندھی تقلید کرنا شروع کی۔ انٹرنیشنلزم سوویت یونین جیسی ایک زبان بولنے والے ملک کے لیے تو موزوں ہوسکتا ہے مگر پاکستان کے لیے نہیں۔ دوسری طرف کمیونزم کو مذہب کے مدمقابل کیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے دانش سے خالی ذہن رکھنے والے رہنما نے یہاں کے لوگوں کی مذہب سے جذباتی وابستگی کو ذرا برابر بھی غور کرنے کے قابل نہ سمجھا جبکہ کمیونزم لوگوں کے معاشی اور اقتصادی مسائل کے حل کا نظریہ ہے۔ جو کمیونسٹ پارٹی لوگوں کے معاشی اور اقتصادی مسائل کے حل کے لیے کمیونزم کی تبلیغ کرتی تو لوگوں کے دلوں میں ضرور کامیابی حاصل کرتی۔ اس لیے کہ عوامی اور سماجی بھلائی کے لیے کمیونزم سے بہتر نظریہ کوئی اور نہیں۔

دوسرا یہ کہ کمیونسٹ پارٹی کی طرف اپنے کارکنوں کو دوسری پارٹیوں کے اندر بھیج کر اور وہاں کے لوگوں کو توڑ کر کمیونسٹ پارٹی میں شامل کرنے والی ناقص حکمت عملی بھی کمیونسٹ پارٹی کو قوت دینے کی راہ میں رکاوٹ ہوگئی۔ کیا کمیونسٹ پارٹی کی ایسی حکمت عملی کا کوئی اخلاقی جواز بھی تھا؟ ایسی غیر معیاری حکمت عملی کی وجہ سے دوسری پارٹیوں کے اندر کمیونسٹ پارٹی کا منفی تاثر جڑنے لگا اور پارٹی کو بہت سارے ہمدردوں سے ہاتھ دھونا پڑا اور سیاست کے میدان میں کمیونسٹ پارٹی Isolation کا شکار ہوگئی۔ آج تک کمیونسٹ پارٹی کا دوسری تنظیموں سے Working Relationship نہ جڑ سکا ہے۔

نذیر عباسی بھی شاہ عنایت شہید اور فاضل راہو کی طرح مظلوم اور پسی ہوئی سندھ دھرتی کا ہیرو ہے۔ اسے صرف لفظوں کی مالائیں پہنانا یا ایک ادھ برسی کا پروگرام ترتیب دینے سے فرض کی ادائیگی نہیں ہوسکتی۔ مگر ہمیں اس کے فکر اور فلسفے کو اپنا کر شہید کی زبان بننا ہوگا۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو دی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر اک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے (فیض)

استحصالی قوتیں آج عراق سے مظلوموں کا خون چوس رہی ہیں۔ آج بھی سندھ کے کسان وڈیروں، جاگیرداروں کے آگے ظلم کا شکار ہیں۔ مزدور سرمایہ دار کے ہاتھوں لوٹ کھسوٹ کا شکار ہیں اور سرکاری ملازم افسر شاہی کے عتاب کا شکار ہیں۔ لوگوں میں انقلاب کی تبدیلی کی تڑپ موجود ہے مگر سندھ کے باشعور لوگ خود مسیحا بننے کے بجائے اس آسرے میں ہیں کہ کرشمہ ہو اور کوئی مسیحا زمین پر اتر آئے۔ کیا نذیر عباسی کا خواب ایسے ہی دھند کا شکار ہو جائے گا، کیا غریب اور پسے ہوئے مظلوم لوگوں کی زندگی میں کوئی خوشیوں کی لہر نہیں آئے گی۔ آخر کب پسینہ بہانے والے محنت کش کو عزت بھری زندگی گزارنے کا حق ملے گا؟ یہ سب ترقی پسند فکر سے منسلک باشعور لوگوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی اخلاقی مدد کریں۔ دکھ سکھ کے ساتھی بنیں۔ نیا لائحہ عمل تیار کریں۔ اپنے قول کو عمل کے ذریعے سیراب کریں۔ لوگوں کے معاشی اور اقتصادی مسائل کے حل کے لیے ان کی آواز بنیں۔ کسی مسیحا اور کرشمہ کا انتظار کرنے کی بجائے ہمیں ہی مظلوموں کی تکلیفوں، دکھوں دردوں کی دوا بننا پڑے گا۔ اسی طرح ہم نذیر عباسی کے خوابوں کی تعبیر کو ممکن بنا سکیں گے۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراؤ کے در و دیوار گرادو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو
(اقبال)

میں سمجھتا ہوں کہ شہید نذیر عباسی پر الفاظ کے پھول نچھاور کرنے کے وقت انصاف سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ دراصل میں نذیر عباسی کی شخصیت کے سارے پہلوؤں پر لکھنا چاہتا ہوں۔ پر افسوس! کہ میری اس کے ساتھ کوئی یاد جڑی ہوئی نہیں ہے۔۔۔ ہمارے بیچ میں کوئی رشتہ ہے تو یہ کہ وہ ہی مقصد اور فکر سے جڑا ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی لیجنڈ کے فکر اور مقصد کو آگے بڑھانے سے ہی اس کی قربانی کا حق ادا کرسکتے ہیں۔

☆☆☆

نذیر عباسی جیوے

پاکستان دا چی گویرا نذیر عباسی جیوے
اوسی سجن متر میرا نذیر عباسی جیوے

آمر دے نال لایا آڈا
او سی سچا لیڈر ساڈا
چناں میرا او ناسی تیرا نذیر عباسی جیوے

جندڑی کر قربان گیا اے
بن او ساڈا مان گیا اے
ہویا اوہدا ناں اُچا انذیر عباسی جیوے

نال غریب دے اوہدی یاری
اوہدے بیلی مزدور تے ہاری
کیتا ساہڈے دل وچ ڈیرا نذیر عباسی جیوے

پایا عارف رتبہ شہیدی
دنیا چھڈی جنت خریدی
حوراں گاون اوہدا سہرا نذیر عباسی جیوے

☆☆☆

کچھ یادگار تصویریں۔۔۔

زرقا عباسی اپنی سالگرہ کے موقع پر
دادی، نانی، پھوپھی اور ماں کے ساتھ

شہید نذیر عباسی کی ایک یادگار تصویر

حمیدہ گھانگھرو کی روپوشی کے دوران زرقا
مختلف مقامات پر، گھوٹکی میں
شبیر بیدار کے گاؤں میں

جب وہ میرے بابا کو لے گئے (ڈیڑھ سال کی زرقا عباسی)

ممتا کی چھاؤں میں زرقا عباسی
کو پہلے دن سکول لے جاتے ہوئے

حمیدہ کی روپوشی کے دوران،
زرقا کی ایک گاؤں میں لی گئی تصویر

زرقا گڑیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے

سخی حسن میں کامریڈ امام علی نازش
اور شہید نذیر عباسی کی
آخری آرام گاہیں

نذیر عباسی اور حمیدہ گھانگھرو شادی کے بعد

شہید نذیر اپنی شادی کے موقع پر اپنے دوستوں، ساتھیوں اور رشتہ داروں کے ساتھ، محراب پور اسٹیشن پر بوقت رخصتی

شہید نذیر عباسی، قاضی اکبر اور اس وقت کے روسی سفیر سندھ نیوز کے دورے پر

شہید نذیر عباسی 1978 میں BSO کے کنونشن (کوئٹہ) میں

ماسکو میں شہید نذیر عباسی کی برسی منائی جارہی ہے

1986ء میں سٹیل مل کے چیئرمین کے خلاف پیپلز ورکرز یونین کے نمائندے پریس کلب کے باہر مظاہرہ کررہے ہیں

کامریڈ منظور صدر PTUDC، حمیدہ گھانگھرو، منظور رضی، صدر پاکستان ریلوے ورکرز اور دیگر ساتھی پاکستان سٹیل ملز کی نجکاری کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے

نذیر عباسی کا کیس ۔۔۔

اختر حسین ایڈووکیٹ

اختر حسین نامور وکیل ہیں مگر سندھ کے لوگوں نے ان کا نام وکیل کے طور پر کم اور ترقی پسند سیاستدان کے طور پر زیادہ سنا ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی، پاکستان سوشلسٹ پارٹی، ورکرز پارٹی اور دوسری ترقی پسند جماعتوں کے سرگرم رہنما رہے ہیں۔ ملک میں انسانی حقوق کے خلاف ہونے والی قانونی جنگ میں ان کا بھی کردار ہے۔ ملک میں ترقی پسند پارٹیوں کے خلاف جو سازشیں ہوئیں ان کو منظر عام پر لانے تک ترقی پسند سیاسی رہنما کی قانونی مدد فراہم کرنے تک اختر حسین ایڈووکیٹ کا کردار قابل تعریف رہا ہے اور بدترین آمریتی دور میں ان کا امر کردار تاریخ میں ہمیشہ یادگار کے طور پر پہچانا جائے گا۔ ملک میں مشہور جام ساقی کیس میں بیرسٹر عبدالودود، اختر حسین ایڈووکیٹ وکیل تھے، 9 اگست 1980ء کو نذیر عباسی کے شہید ہونے کے بعد عبدالودود اور اختر حسین نے ہائی کورٹ میں نذیر کی بیوی حمیدہ گھانگھرو کی طرف سے پٹیشن داخل کی تھی، نذیر عباسی کی شہادت اور کیس کے متعلق کی گئی بات چیت یہ تھی۔

سوال: آپ نذیر عباسی اور اس کے ساتھیوں کے وکیل تھے؟ آمریتی اور مارشلائی دور میں وکیل ہونے کے وقت کیا محسوس کیا اور آپ کو کون سی مشکلات پیش آئیں؟

جواب: اصل میں اس کیس کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو یہ ہے کہ جنرل ضیاء نے یہ کیس ترقی پسند اور کمیونسٹوں کے خلاف بنایا تھا اور ہم جمہوریت پسند ہونے کے ناطے اس کیس کو رد کر رہے تھے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کیس کو ہم انسانی اور جمہوری حقوق کے خلاف سازش سمجھ رہے تھے۔ بطور وکیل اپنا فرض سمجھتے ہوئے لڑے، کیونکہ ضیاء کے پورے دور میں جو بھی انسان ملٹری کے رول کی مخالفت کرتا تھا اسے ملک دشمن کہا جاتا تھا۔ اس وقت ملک کی حالت یہ تھی کہ ملک میں جمہوری ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے فوج کا سیاست میں عمل دخل بڑھ گیا تھا۔ اس وقت جو لوگ کہتے تھے سیاست میں فوج کی مخالفت غلط ہے آج اتنے سال گزرنے کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ وہ لوگ جو جمہوری اداروں کی بحالی اور فوج کی مخالفت کرتے تھے وہ صحیح تھے۔ دوسری بات ہے ڈیموکریٹک اسٹینڈ کی، اس کے اداروں کی زیادہ مخالفت نہ صرف عوام کے لیے بلکہ ملک کے لیے بھی خطرناک ہے اور آج اس کا ثبوت بھی مل گیا ہے اور آج یہ سب کچھ ثابت ہو رہا ہے کہ آئی ایس آئی اور دوسری ایجنسیاں کیسے سیاست میں ملوث تھیں۔ میں کہتا رہا ہوں کہ آئی ایس آئی کا باقاعدہ سیاسی رول 1973ء سے شروع ہوا، نیب کے دور میں انٹر سروسز ایجنسی ''آئی ایس آئی'' نے بنیادی سیاسی کام شروع کیا۔ خود اسلم بیگ نے یہ بات کی ہے کہ ہمیں سیاسی ذمہ داریاں 73ء کے بعد دی گئیں۔ اس حوالے سے ہم سمجھ رہے تھے کہ مارکسسٹ یا ترقی پسندوں کے خلاف جو کیس ہوئے وہ سب بے بنیاد تھے۔ اس لیے کہ آگے چل کر کیس کرنے والے خود ان کیسوں سے دستبردار ہو جائینگے۔ ایسے سارے کیس نیب کیس سازش کیس یا کمیونسٹوں کیخلاف ہوئے وہ سب کیس اب جھوٹے ثابت ہو چکے ہیں۔ اس لیے ہم نے ان کیسوں کے خلاف جو قانونی جنگ لڑی تھی وہ جنگ صحیح تھی۔

سوال: نذیر عباسی کا کیس کچھ منفرد بن گیا ہے! یعنی نذیر کا کیس شہید ہونے کے بعد اس کیس کو منظر عام پر لانے کے لیے آپ کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، ایک وکیل کے طور پر آپ نے اس وقت اس کیس کو کیسے محسوس کیا؟

جواب: خود میرا ذاتی طور پر اس وقت ایسے لوگوں سے واسطہ تھا جو اس مقصد کیلئے لڑ رہے تھے۔ جس مقصد کیلئے نذیر جدوجہد کر رہا تھا اور دوسرا کہ ایک جمہوری رائٹ کے لیے لڑنا وکیل کی ڈیوٹی میں شامل ہے اور انسانی حقوق کے خلاف ہونے والی خلاف ورزی کے خلاف آواز اٹھانا وکیل کے پروفیشن ازم کا حصہ ہیں اس لیے میں نے سب کچھ محسوس کرتے ہوئے یعنی آرمی سمیت مختلف مختلف اداروں کی مخالفت تو کی مگر اس کے باوجود نذیر عباسی کا کیس بطور ایک وکیل میں نے لڑا۔

> **نذیر عباسی کے کیس میں خود سرکاری اہلکاروں نے یہ بات مانی ہے کہ نذیر عباسی کی موت اداروں کی تحویل میں ہوئی ہے اور اس کے ہمارے پاس دستاویزی ثبوت موجود ہیں**

سوال: اس وقت آپ کے لیے کوئی رکاوٹیں پیدا ہوئیں؟

جواب: عدالت تک پہنچنے والے مرحلے تک تو کوئی رکاوٹیں نہیں تھیں۔ سوائے پروفیشنل کیریئر میں رسک اٹھانے والی بات، جو میں نے آپ کو بتائی ہے۔ باقی نذیر عباسی یا جام ساقی کیس کے بہ نسبت نیب والے کیس میں عدالت تک پہنچنے میں بھی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں تھیں۔ اس لیے کیس جیل کے اندر چلتے تھے ہم مختلف وکیل کیس لڑنے کے لیے حیدرآباد جاتے تھے۔ اس وقت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جیل والے کہتے تھے کہ ہم آپ کے بریف کیس چیک کریں گے مگر ہم انہیں کہتے تھے کہ ہم اپنے کیس کی دستاویز آپ کو کیسے دینگے؟ اس پر اکثر جھگڑا ہوتا تھا۔ دوسرا یہ کہ کورٹ کی طرف سے حکم تھا کہ ہمارے رہنے کے لیے اچھے ہوٹل کا حکومت بندوبست کرے۔

مگر بااختیار عملداروں کی طرف سے الٹ کیا جاتا تھا۔ ہمیں کسی بھی ہوٹل میں کمرہ نہیں ملتا تھا اور کبھی کبھی مجبور ہو کر ہم وکیلوں کی چھوٹے فٹ پاتھی ہوٹلوں میں رہنا پڑتا تھا جب کہ اس وقت سرکاری وکیلوں کو سرکاری ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا جاتا تھا۔

سوال: اتنے سال گزر جانے کے بعد قانونی نقطہ نگاہ سے اس وقت نذیر عباسی کے کیس کو دوبارہ کھولنے پر آپ کیا کہیں گے؟

جواب: نذیر کے کیس کے بارے میں میرا خیال یہی ہے کہ اس کیس کے جوابداروں کیخلاف تحقیقات ہونی چاہیے کیونکہ قانونی طور پر ایک ایف آئی آر داخل ہے، قتل کی ایف آئی آر داخل ہونے کے بعد اس کی انویسٹی گیشن ہونا قانونی فرض ہے۔ آج تک نذیر عباسی کے دوست ساتھی مطالبہ کرتے آئے ہیں کہ اس کیس کی تحقیقات ہونی چاہیے اور یہ مطالبہ بالکل قانونی اور اصولی اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ آج میں ایک وکیل کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ انصاف کے تقاضے پورے ہونے چاہئیں کیونکہ نذیر عباسی کے کیس میں خود سرکاری اہلکاروں نے یہ بات مانی ہے کہ نذیر عباسی کی موت اداروں کی تحویل میں ہوئی ہے اور اس کے ہمارے پاس دستاویزی ثبوت موجود ہیں تو پھر سرکار کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اس کیس کی پوری پوری تحقیقات کروائے اور کیس میں ملوث لوگوں کو بے نقاب کرے۔ ☆☆☆

سب کا مان سمان نذیر عباسی شہید

دو بہنیں
دو انقلابی
زبیدہ گھانگھرو
حمیدہ گھانگھرو

زبیدہ گھانگھرو

کبھی کبھی ذہن کی مشقت جسم کی مشقت سے زیادہ گراں گزرتی ہے، میں ماضی کی وہ یادیں کس طرح بھلا سکتی ہوں جو میری زندگی کو خوبصورت بنانے کا وہ سرمایہ ہیں جن کی بدولت میں خود کو اب تک توانا کیے ہوئے ہوں۔ 1975ء کے زمانے کی وہ یاد بھلا کیسے بھلائی جاسکتی ہے جس میں میری چھوٹی بہن حمیدہ گھانگھرو کے ہمراہ خود میں نے اسکول اور کالج کی جمہوری آزادی کا مطالبہ کیا ہو۔ گو اس مطالبے پر ہم نے جیل یاترا بھی کی۔

نارا جیل میں میری بہن کے نرالے نخرے تھے۔ وہ اس وقت تک ایک بردبار طلبہ رہنما کا روپ دھار چکی تھی۔ مگر چھوٹی ہونے کے ناطے اس کی فرمائشیں وہی تھیں جو کہ اس کی فطرت کا تقاضا تھا۔ وقت کا دھارا گزرتا گیا۔ 1978ء میں ہماری شادیاں بھی ساتھ ہوئیں۔ وہ رخصت ہو کر سدھاری جبکہ میں سکھر میں آن بسی، ان فاصلوں نے ہم دونوں کو کبھی دور نہیں ہونے دیا۔ میں نے اسے ہمیشہ مسکراتا، ضدی اور نڈر دیکھا، مگر ایک روز وہ زخموں سے چور ذہن کیساتھ سکھر پہنچی، وہ 9 اگست کی وہ بدنصیب گھڑی تھی جب ہم سے شہد سے زیادہ شیریں ہمارا ساتھی، میرا بھائی سمان بہنوئی نذیر عباسی اس دنیا کو جسمانی طور پر الوداع کہہ کر روحانی طور سے ہمیشہ امر ہو گیا تھا۔ بھائی سمان نذیر کی جب بھی یاد آتی ہے تو جسم سن ہو کر رہ جاتا ہے، میرے بچے سمجھ جاتے ہیں کہ کس غم و اندوہ کی کہانی میں مبتلا ہوں۔

میں اپنے اس عزیز ترین ساتھی کیلئے ان چند ساتھیوں کو سرمایہ گردانتی ہوں مگر جب مجھے ہوش آتا ہے تو اس امر انسان کے کردار کو ہمیشہ سمجھ کر اپنے دور کی مایوسی کو کفر سمجھتے ہوئے عہد کرتی ہوں کہ بھائی سمان نذیر تم ہمیشہ ہو۔

ہم کیا ہماری آئندہ مسکرانے والی نسل کے دلوں میں بھی زندہ رہو گے۔ جب تک تاریخ کے اوراق باقی ہیں نذیر عباسی کو نہیں مارا جاسکتا۔

☆☆☆

ایوانِ عدالت میں

فہمیدہ ریاض

ایوانِ عدالت میں
پتھرائی ہوئی آنکھیں
پتھرائے ہوئے چہرے
پتھرائی ہوئی سانسیں
چمڑے کی زبانوں پر
پتھرائی ہوئی باتیں

فریاد کٹہرے میں
رو رو کے تڑپتی تھی
قانون کے رکھوالے
کل لے کے گئے جس کو
اب اس کو یہاں لائیں
وہ نعش تو دکھلائیں۔۔۔

پتھرائے ہوئے چہرے
پتھرائی ہوئی آنکھیں
چمڑے کی زبانوں پر
لچکی ہوئی کچھ باتیں
پتھر کہ جو چکنے تھے
ہاتھوں سے پھسلتے تھے
قانون کے نکتے تھے
کیا لوگ سمجھتے تھے
سنگین مجبوری ہے
درخواست ادھوری ہے

پتھرائے دلوں میں تو
بس ریت برستی تھی
ہر آنکھ کہ پتھر تھی
اشکوں کو ترستی تھی
یکدم کوئی دل دھڑکا
شعلہ سا کہیں بھڑکا
جب تک کہ کوئی سمجھے
لو پھوٹ بہے دھارے
آوازیں ملیں باہم
اور گونج اٹھے نعرے
معصوم سی جانوں کے
بے تاب جوانوں کے

کیا شور لہو کا تھا
کیا گونج تھی نعروں میں
ایوانِ عدالت میں
پتھرائے ہوئے کمرے
دم روک کے سنتے تھے

جب سرخ سلام آیا
مقتول کا نام آیا
گھونسہ سا لگا دل پر
آنکھوں سے لہو پھوٹا
جیتے رہو دل والو
پتھر تو کوئی ٹوٹا

ہم جھوٹ کا کچھ نہیں چاہتے

پاش

پاش کی یہ نظم میں نے شہید نذیر عباسی کو سنائی تھی، نظم سن کر اس نے اصرار کیا کہ میں 'سرخ پرچم' کے لیے اس کا ترجمہ کروں۔ 1988ء میں پاش کو خالصتانی جنونیوں نے شہید کر ڈالا۔ سرخ پرچم میں شائع ہونے والی یہ نظم نذیر کی یادوں کے نام۔ (احمد سلیم)

ہم جھوٹ موٹ کا کچھ نہیں چاہتے
جس طرح ہمارے بازوؤں کی مچھلیاں ہیں
جس طرح بادلوں کی پیٹھ پر ابھرے نیل کے نشانوں
جیسے زخم ہیں

جس طرح قرضے کے کاغذوں میں
ہمارا سہا ہوا، سکڑا ہوا مستقبل ہے
ہم زندگی، برابری یا کچھ بھی اور
اسی طرح کا سچ مچ کا دیکھنا چاہتے ہیں

جس طرح سورج، ہوا اور بادل
گھروں اور کھیتوں میں ہمارے انگ سنگ رہتے ہیں
ہم اسی طرح حکومتوں، اعتقادوں اور خوشیوں کو
اپنے انگ سنگ دیکھنا چاہتے ہیں
حکمرانو! ہم سب کچھ، سچ مچ کا دیکھنا چاہتے ہیں

ہم اس طرح کا کچھ نہیں چاہتے
جیسے شراب کے مقدمے میں ٹاؤٹ کی گواہی ہوتی ہے
جیسے پٹواری کا ایمان ہوتا ہے یا جیسے آڑھتی کی قسم

ہم اپنی ہتھیلی پر کوئی اس طرح کا سچ چاہتے ہیں
یا گڑ کی پت میں رس ہوتا ہے یا حقے میں نکوٹین
جیسے ملاقات کے وقت محبوب کے ہونٹوں پر
بالائی جیسا کچھ ہوتا ہے

ہم نہیں چاہتے، پولیس کی لاٹھیوں پر کتابوں کو پڑھنا
ہم نہیں چاہتے ہنر کا گیت فوجی بوٹوں کی ٹاپوں پر گانا
ہم تو درختوں پر چھنکتے سنگیت کو
ترسی ہوئی پوروں کیساتھ چھو کر دیکھنا چاہتے ہیں

آنسو گیس کے دھوئیں میں لہو چاٹنا
یا اپنی زبان پر اپنے ہی لہو کا ذائقہ چکھنا
کسی کے لیے بھی خوش کن نہیں ہو سکتا
لیکن
ہم جھوٹ موٹ کا کچھ نہیں چاہتے
اور ہم سب کچھ سچ مچ کا دیکھنا چاہتے ہیں
زندگی، سوشلزم یا کچھ بھی اور

(پنجابی سے ترجمہ: احمد سلیم)

......☆......　　......☆......

جدوجہد میں تیری آواز شامل ہو۔۔۔!!!

حمیدہ گھانگھرو

ان قدموں کو میں کیسے بھلاؤں جس کی مٹی میں تیری خوشبو ہے

اس مٹی کو مانگ کا سندور بناؤں جس مٹی میں تیرا لہو شامل ہے!

......حمیدہ......

اگر کسی کو دنیا کی حسین خوبصورت دیواروں، پہاڑوں، دریاؤں کی لہروں، سمندر کی گجگوڑ، اڑتی ریت کی تیز آوازیں، درختوں میں پرندوں کی میٹھی آواز، بانسری کی سریلی آواز چنگ کو ہونٹوں پر رکھ کر دل کی گہرائیوں میں سمندر ساز پر گنگنانہ، رات کے اندھیرے میں ٹمٹماتے تارے اور صبح کی پہلی کرن کو دیکھنے کی خواہش کے بعد دھرتی کا حسین منظر زندگی کے لیے سر درد ہو تو اس وقت موت کس قدر بھیانک اور انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ سب کو مرنا ہے، مرنا عیب نہیں۔ موت کیسے لکھی گئی ہے۔ کسی کو خبر نہیں۔

موت بیماری، حادثاتی، چوری ڈاکے کے مقابلے میں قتل اور کتنے ہی بے شمار گناہوں کی وجہ سے سزا کے طور پر مل سکتی ہے۔ پھانسی کے پھندے تک پہنچنے کے لیے کانپتے ہوئے جسم کو گھسیٹ کر سیاہ ٹوپی پہنا کر زبردستی سانس نکالی جاتی ہے مگر یہ کیسی موت ہے جس کو ایک انقلابی اپنے گلے کا خوبصورت ہار سمجھ کر فخر سے کہے کہ میری زندگی ایک گیت ہے میری موت جدوجہد کی علامت ہے۔ جس چیز کا وجود ہے اس کو فنا بھی ہونا ہے۔ ہم سب کو مرنا ہے۔ موت سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا، مگر موت کو مارنا یہ بہت بڑی فتح ہے۔ بہادر مائیں موت کو مارنے والے ایسے بیٹے صدیوں میں پیدا کرتی ہیں جو موت کو گلے لگا کر جینے کا حوصلہ دیں۔

وہ تاریخ نہ مٹنے والی تاریخ جب منصور کو سولی پر لٹکایا گیا ایسی تاریخ جب بلاول کو چکی میں پیسا گیا، ایسی تاریخ سرمد کی بھی ہے اور بھگت سنگھ کی بھی، یہ تاریخ شاہ عنایت کی بھی ہے تو ذوالفقار بھٹو کی بھی، یہ تاریخ حمید بلوچ کی بھی ہے تو بے گناہ سزائیں کاٹنے والے سیاسی کارکنوں کی بھی۔ اسی تاریخ نے اپنے قلم کے آنسو بہا کے ایک اور نام لکھا۔ "نذیر عباسی شہید"! فیض احمد فیض نے کہا ہے جس دن سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی پرواہ نہیں۔ نذیر عباسی کی جسمانی دوری نے دلوں میں ٹوٹتے پہاڑ کی طرح گھاؤ کیے۔

مگر اس کی جدوجہد، پرعزم حوصلہ، آمریت کے آگے نہ جھکنا اور یہاں کے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ طبقے کے خاتمے اور محنت کش راج کی کامیابی کے لیے اس کی شہادت ہر جدوجہد کرنے والے کے لیے مشعل راہ ہے۔ مجھے چی گویرا کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں کہ مرنا عیب نہیں! اگر ہمارے پیچھے ساتھی ماتمی جنازہ نہ اٹھائیں بلکہ آزادی کی جنگ کو مضبوط کریں، جیسے سامراج اور اس کے پالتو کتوں کو خبر پڑے کہ انقلاب کے لیے جدوجہد کرنے والے سر کٹاتے ہیں جھکاتے نہیں۔ نذیر عباسی بھی اسی سفر کا راہی تھا۔

اس نے اپنے نظریاتی راہنماؤں اور سچائی کی جدوجہد کرنے والوں سے یہی کچھ سیکھا تھا۔ نذیر نے موت کو شرمندہ کیا۔ 27 سال پہلے جس بارود سے بھری ہوئی بدبودار ٹارچر سیل میں بندوقوں کے بٹ اور شیشوں کی پلیٹ پر لٹا کے ٹارچر کیا تھا ان کو زنگ لگ گیا ہوگا۔ وہ ٹارچر کرنے والوں کے ہاتھ عمر کی آخری دن گنتے ہوں گے۔ اس وقت انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ خوبصورت بہادر اور نڈر نوجوان جوانی کی سب امیدوں، خواہشوں کو قربان کر کے عظیم مقصد کے لیے ہمیشہ ہمیشہ امر بن جائے گا۔

عظیم انقلاب کا تصور نذیر کی جدوجہد کے لیے مشعل تھا۔ وہ رات کے اندھیرے کو دیکھنے سے پہلے یقین سے کہتا تھا کہ صبح ہونی ہے۔ آج بھی نذیر عباسی آدرشی زندگی کے سامنے دھرتی پر کھلے ہوئے پودے کی مانند ہے۔ اس کا نام فخر کا احساس دلاتا ہے۔ مایوسی اور تنہائی میں نذیر عباسی کا نام ضمیر کو جھنجھوڑ کے جگانے کی علامت ہے۔ نذیر کو کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ اگر فکر مند تھا بھی تو تنظیمی کام کو آگے بڑھانے کے لیے۔ ایک دن میٹنگ میں جلدی جانا تھا صفت رند اور انعام رند بیٹھے تھے، میں نے چائے پیالی میں دی اس لیے کہ جلدی ٹھنڈی ہو جائے مگر نذیر نے مذاق میں ساتھیوں کو کہا دیکھو حمیدہ مجھے سقراط کی طرح زہر کا جام پلانے کا تجربہ کروا رہی ہے۔

میں تھوڑی ناراض ہوئی تو ایک دم بہت ہی پیار سے کہنے لگا ایک عام عورت اور تنظیمی ساتھی میں یہی فرق ہے کہ ذہنی طور پر اسے ہر بات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ انقلابی کسی بھی وقت بہت اذیتوں اور مشکلوں سے گزر سکتے ہیں اور مجھے روس کی زویا لنا تا تولیا پر لکھی گئی کتاب دے کر کہا یہ پڑھو۔ اس وقت میری عمر بھی اتنی تھی جتنی زویا کی اس کتاب میں۔ اور شام کو واپس آ کے ٹیچر کی طرح کتاب پر تبصرہ کرنے اور سوالات کرنے لگا۔ زویا کے ساتھی ایک ایک ہو کے اسے چھوڑ جاتے ہیں۔ آخر میں اپنے صرف ایک ساتھی کے ساتھ ہیڈ کوارٹر پر پہنچی ہے۔ گرفتار ہونے کے بعد اس پر

بے تحاشا ٹارچر ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوتی ہے۔ مگر زویا کی لٹکی ہوئی لاش اس وقت پرندوں کی نذر اور دھوپ کی تپش میں ختم ہو جاتی ہے۔

مگر آج وہاں پر انقلاب کا سرخ جھنڈا لہرا رہا ہے اور اس کا سایہ ہم بھی محسوس کر رہے ہیں۔ ایک دن یہاں پر بھی سرخ جھنڈا ضرور لہرائے گا۔ نذیر کو جیسے ہر بات کا یقین تھا جبکہ 1960ء میں حسن ناصر کو شاہی قلعے کے بدنام اذیت گھر میں تشدد کر کے مارا گیا تھا اور اس کی کوئی بھی داد رسی نہیں ہو سکی اور کوئی فریاد داخل نہ ہوئی سوائے اس کے پاکستان کی کیمونسٹ پارٹی کے لیے ایک بہت بڑی مثال تھی۔ دیکھا جائے تو انقلاب کی تاریخ بھی عظیم کرداروں کی مثالوں سے بنتی ہے۔

ہمت اور حوصلے کے لیے اس وقت کیمونسٹ پارٹی جو تعداد میں چاہے کم تھی مگر اس کے نظریاتی کارکنوں کی جدوجہد کسی گوریلوں سے کم نہ تھی۔ فرضی ناموں اور خفیہ سرگرمیوں سے پارٹی کو زندہ رکھنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ آج اس کے لیے چاہے کچھ بھی کہا جائے۔ پاکستان بننے کے بعد ایوب خان سے لے کر ضیاء کے دور تک کیمونسٹ پارٹی بہت بڑا خطرہ تھی۔ اس مشکل دور میں پارٹی سے منسلک کارکنوں کی قربانیاں بھولنے کی نہیں بلکہ ان کی جدوجہد آج کی جدوجہد کے لیے مثال ہے۔ شہید پارٹیوں کو جوڑتے ہیں توڑتے نہیں۔ پارٹیوں کو توڑنے والی لیڈرشپ کے رویے اور منافقت کا سبب بنتی ہیں۔ نذیر آج بھی زندہ ہے اور امر ہے۔

شہادت والے دن اسکی آخری آرام گاہ پر جا کے اس کے آدرشوں کو یاد کرنا ہے۔ پھولوں کی چادریں چڑھا کر دعا مانگنا نہیں بلکہ ہم سب یہ عہد کرتے ہیں کہ اس کی جدوجہد ابھی ختم نہیں ہوئی۔ آج بھی انقلاب کے راستے پر سفر کرنے والے اس کے پیغام کو دہراتے تھے کہ ہر دور میں ظلم، جبر، بربریت کو للکارتے ہوئے فرسودہ سماج کے طبقاتی نظام کی دیوار کو گرائینگے اور محنت کشوں کی آواز بن کر ابھریں گے۔ اس لیے کہ یہ شہید کا پیغام ہے۔ شہید کسی بھی ایک قوم، ایک فرد، ایک خاندان کی میراث نہیں ہوتے بلکہ پارٹیوں کے لیے سمبل ہوتے ہیں۔ نذیر عباسی ایک جدوجہد ہے وہ اپنی ذات میں ایک بہت بڑی پارٹی ہے۔ نذیر ایک پارٹی سے منسلک تھا جو حکمرانوں کے لیے خوف اور کارکنوں کے لیے جلتے ہوئے انگاروں پر ننگے پاؤں پر چلنے کے برابر تھی۔ ایک انقلابی کی پہچان بھی مشکل وقت میں آزمائش پر پورا اترنا ہے۔

نذیر عباسی اور حمیدہ گھانگھرو کی یادگار تصویر

اس کے جسم کی اہمیت صرف اس وقت تک ہے جب تک سچے کارکن کی حیثیت میں کام کریں۔ ٹارچر سیل میں نظریہ سچائی پارٹی کمٹمنٹ کے آگے جسم کی کوئی بھی اہمیت نہیں۔ کامریڈ لینن نے کہا تھا میرے مرنے کے بعد میرے جسم کو چاہے کہیں بھی کر دو پرواہ نہیں۔ ایک انقلابی جب اذیت گاہ میں ہوتا ہے تو اسے معلوم ہے کہ اسے کیا بچانا ہے نظریہ یا جسم؟ نذیر نے کامریڈ لینن کے قول کو کسی حد تک پورا کیا۔ اذیت گاہ کی اس خوفناک رات میں ایک سچے انقلابی کے جسم کو چکنا چور کر کے سینے میں سمیٹے ہوئے راز فاش کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اسے یہ ثابت کروانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ کیمونزم کا نظریہ خداداد مملکت میں کسی خراب گالی سے کم نہیں۔ نذیر نے اپنے جسم کی پرواہ نہ کی جبکہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے جسم کو آخری دیدار کے لیے ذاتی اور سیاسی ورثاء کے حوالے کیا جائے گا بھی کہ نہیں؟

اپنی پیاری بیٹی جسے ہمیشہ چہرے کے سامنے لا کے کہتا تھا یہ میرا موتیا گل ہے۔ اس نے بھی اس کے چہرے پر اپنے چھوٹے ہاتھوں کی انگلیوں سے نہ چھوا۔ ماں جس کی گود میں ہمیشہ سر رکھ

کے کہتا تھا ماں میں تھک گیا ہوں مجھے سلاؤ۔ اس کی ماں سے ایسی فرمائشیں کرنے سے ماں کی محبت کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ کتنے رشتے دار دوست ساتھی ہمیشہ اس کے انتظار میں رہتے تھے کہ کب نذیر آئے گا۔

آج بھی وہ اپنے دروازوں کی طرف اس امید سے دیکھ رہے ہیں کہ نذیر زندہ ہے اور اچانک آجائے گا۔ میرے ساتھ اس کے بہت سے رشتے تھے، پیار، محبت، نظریہ، سچائی، جدوجہد، تنظیمی ساتھی، تنظیمی راہنما، ہر دکھ سکھ، درد کا رشتہ! جب آنکھوں سے آنسو بہتے تو جھولی میں جانے سے پہلے پکڑ لیتا، غربت، مفلسی، پریشانی کو پیار کی چادر میں لپیٹ کر صبح کے سورج کی کرنوں کی طرح روشنی کی علامت اور جینے کا حوصلہ ہوتا تھا۔ تمام باتوں کے باوجود ایک دوسرے سے یہ کمٹمنٹ تھی کہ جدوجہد کے دوران تنظیمی کام کو اہمیت اور کسی بھی بڑی قربانی سے نہیں گھبرانا ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ شادی کے ایک مہینے کے بعد پارٹی فیصلے کے مطابق مجھے پٹ فیڈر اپنی ساتھی آصفہ رضوی کے ساتھ کسانوں کی تحریک میں شامل ہونے کے لیے جانا پڑا اور پٹ فیڈر بلوچستان بھوک ہڑتال کے بعد گرفتار کر کے مچ جیل بلوچستان بھیجا گیا۔ میں جیل میں تھی تو نذیر پر شادی کا بے بنیاد کیس بنا کے کہا۔ آپ نے شادی نہیں بلکہ جلسہ کیا تھا اس جرم میں گرفتار کیا۔ گرفتار ہونے کے بعد اس کے والد محترم جان محمد عباسی فوت ہوگئے مگر نذیر کو اپنے والد صاحب کے آخری دیدار کے لیے بھی رہا نہیں کیا گیا۔ بلکہ تین مہینوں کے بعد مچ جیل سے میں آزاد ہو کے جب کنڈیارو لا کپ پر اسے ملنے آئی تو دو دن کے بعد وہاں سے اس کو نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔

میں نے حبس بے جا کی رٹ پٹیشن داخل کروائی اور مسلسل احتجاج کیا۔ جس کے دباؤ کی وجہ سے پانچ مہینوں کے بعد ڈرامائی انداز میں نذیر عباسی کو قلی کیمپ سے آزاد کیا گیا۔ اس کی آزادی کے بعد اس نے بتایا کہ مجھے قلی کیمپ میں ٹارچر کیا گیا اور مارنے کی دھمکی دی گئی۔ موت کے خوف کو نذیر نے کبھی بھی اپنے اوپر مسلط نہیں کیا بلکہ سب ساتھیوں کو مذاق میں کہتا تھا کہ دیکھو حمیدہ اور میں ہنی مون بلوچستان کے خوبصورت پہاڑوں میں گزار کے آئے ہیں۔ اس نے مچ جیل بلوچستان اور میں نے قلی کیمپ کوئٹہ۔ اس کی آزادی کے بعد دوبارہ اس کے وارنٹ نکالے گئے اور اسے انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا۔ پانچ جولائی 1977ء کو فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء نے ملک کے نامزد وزیر اعظم کو رات کی سیاہ تاریک میں چور دروازے سے آ کے اپنی ہوس کا شکار کر کے 4 اپریل 79ء کو ذوالفقار علی بھٹو جیسے بہادر لیڈر کو پھانسی دی گئی۔

یہ خبر سب کے لیے دکھ دائک تھی اور آمر جنرل ضیاء کے خلاف جدوجہد کو تیز کرنا ہے۔ بھٹو صاحب نے سوشلزم کا نعرہ دیا تھا باوجود اس کے وڈیروں اور جاگیرداروں کا قبضہ رہا اس لیے روٹی کپڑا اور مکان والے نعرے کو وہ فوقیت نہ ملی جو ملنی چاہیے تھی۔ مگر پی پی پی کے بنیادی منشور سے سوشلزم کے نعرے کی کوئی بھی نفی نہیں کر سکتا۔ جیسا کے سوشلزم اور کمیونزم کے نظریات شعور کے تحت سماج کی تبدیلی اور طبقاتی نظام کے فرق کو مٹانے کے لیے بہت قریبی رشتہ رکھتے ہیں۔ اس لیے آمر ضیاء کو دوسری پارٹیوں سے اتنا خطرہ تھا یا نہیں وہ تو تاریخ ثابت کرے گی مگر کمیونسٹ پارٹی فوجی حکمرانوں کی تپتی ہوئی ریت پر فوجی حکمرانوں کے لیے جلتی پر تیل ڈالنے کے برابر تھی۔ اس لیے بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد پہلا نشانہ کمیونسٹ پارٹی کو کیا گیا۔

مگر تاریخ نے ثابت کیا کہ ٹارچر سیل کی کال کوٹھی میں نذیر عباسی نے کہا میں کمیونسٹ ہوں۔ کمیونزم کے نظریے کے تحت سماج میں شعور اور حقیقی انقلابی تبدیلی آسکتی ہے۔ ایک بہادر انقلابی تھا اور انقلابی کی جڑیں پسے ہوئے عوام مفلس کسان اور مزدوروں طالب علموں عورتوں اور بچوں کے بنیادی حقوق کی لڑائی تک جاری رہی ہیں۔ مگر کمیونسٹ پارٹی کی کمزور قیادت کی وجہ سے نذیر عباسی کی شہادت کے بعد کمیونسٹ پارٹی کئی دھڑوں میں تقسیم ہوگئی جبکہ نذیر کی موت نے بہت سارے ساتھیوں کی زندگی کو بچالیا۔ اسکی پہچان جس پارٹی سے تھی جس سے وہ منسلک تھا اسے کوئی نہ بچا سکا۔

مگر وقت نے یہ ثابت کیا کہ آج ہر باشعور خود کو کمیونزم کے نظریے کے تحت جدوجہد کرنے کا قائل ہے۔ آج ہر باشعور اپنے آپ کو کامریڈ کہلواتا ہے یہ دراصل نذیر عباسی کی قربانی کی فتح ہے۔ اس لیے کہ پاکستان کی تاریخ میں نذیر عباسی کمیونسٹ تحریک کے مورچہ کا حسن ناصر کے بعد وہ شہید ہے جس کی بہادری اور عظمت کو سلام کیا جاسکتا ہے۔ نذیر عباسی کی کمیونسٹ پارٹی کمیونزم کے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے اس کی شہادت کے بعد کمیونزم مارکسزم کا نظریہ منظر عام پر آگیا۔ نذیر عباسی کو ایک عام سندھی روایتی گھرانے کی بہادر عورت نے اپنا دودھ پلایا تھا مگر اس کا نظریہ اور سوچ سماج کے پسے ہوئے طبقے ظلم اور جبر کے خلاف تھا۔ وہ سرخ رنگ کو پسند کرتا تھا۔

انقلابی سرخ جھنڈا ہاتھ میں اٹھائے ہوئے فخر محسوس کرتا تھا مگر اسے پتا تھا یا نہیں کہ اس کے جسم سے لپٹا ہوا سفید کفن سرخ ہو جائے گا اور بہتے ہوئے خون سے ایدھی صاحب غسل دلوانے کے بعد دھرتی ماں کی جھولی میں ڈالیں گے۔ نذیر کے جسم پہ کتنے گھاؤ تھے۔ ہم میں سے کسی نے بھی نذیر کو آخری دفعہ نہیں دیکھا۔ اگر کبھی بھی موتیا (نذیر کی بیٹی) کو خیال آیا کہ اپنے باپ کے قاتلوں کی شناخت کرے اور اس کے باپ کو کیسے اور کس نے مارا؟ اس کے جسم پر کتنے زخم تھے تو ایدھی صاحب نہ صرف آنکھوں دیکھا گواہ ہے بلکہ غسل دینے کے دوران زخموں کو دھونے والے ایدھی صاحب کے ہاتھوں کی انگلیاں بھی گواہ ہیں۔ یہ تو تاریخ کو ثابت کرنا ہے کہ موتیا کے اٹھائے ہوئے احتجاجی ہاتھوں کو ایدھی صاحب کے ہاتھ اور نذیر کو آخری دفعہ دیکھنے والی آنکھیں کیا انصاف دلاتی ہیں۔

بہر حال نذیر کی جدوجہد رنگ نسل مذہب زبان سے بالاتر ہو کے انقلاب کی منزل پر جدوجہد کرنے والے ایک انقلابی کی شہادت ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ہم سب عہد کریں کہ انقلابی جدوجہد کے کارواں میں نذیر عباسی کا ساتھ کبھی نہ چھوڑیں۔ نذیر عباسی کو سرخ سلام۔

☆☆☆

میں اپنے اور اپنے ساتھیوں پر ہونے والے تشدد کی تفصیل دہرا کر نہیں چاہتا کہ آپ کا جی متلا جائے، مجھے ڈر ہے آپ وحشت میں کہیں متلی نہ کرنے لگیں۔ میں آپ کے سامنے صرف ایک بات دہرانا چاہتا ہوں کہ وہ 8 اگست 1980ء کی ایک صبح تھی جب کامریڈ نذیر عباسی شہید کو بھیڑیوں کے گھیرے سے نکالا گیا۔ زنجیر بکف جوان رعنا کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی گئی، اس کا پروقار وجود زنجیروں سے چھن کرنہ جانے کہاں چلا گیا۔

جناب پھر مجھے بتایا گیا کہ اس سے محنت کشوں کیلئے جینے کے جرم میں انتقام لیا گیا ہے۔ پھر پتہ چلا کہ جب اس کا بے جان جسم دفن کیا گیا اس وقت اس کے جسم پر کاٹنے کے نشانات تھے اور سینے میں دل نہیں تھا۔ ان بھیڑیوں نے کامریڈ شہید کا دل نکال لیا تھا اور اسے اپنے وحشی دانتوں میں چچوڑا تھا۔ آپ کو پتہ نہیں ان کمینوں نے اس گلاب جیسے دل کو لوہے کے پنجوں سے اور دانتوں سے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے، جس میں محبت کا سورج جلتا تھا۔ محبت کے پہاڑ افتادہ تھے، جوش کے بے انت طوفان اٹھتے تھے، یہ دل کروڑوں انسانوں کے لیے دھڑکتا تھا اور ان گنت دل اس کے ساتھ دھڑکتے تھے۔ اتنا پیارا انسان اور اس پر تہمت لگائی گئی کہ وہ ملک کا خوفناک ترین آدمی تھا۔ شرم! شرم!

جناب! موت سے لیکر بار بار موت اور ہر گھڑی، ہر پل چلا چلا کر موت کی دھمکیاں یا ان سے بچنے کیلئے ساتھیوں سے غداری! میرے لیے یہی دو راستے چھوڑے گئے لیکن میں نے خودکشی کی بجائے شہادت کا راستہ سوچا۔ شاید اسی وقت کے لیے شاعروں کے سرتاج شاہ عبدالطیف بھٹائی نے کہا ہے۔

دوسرے قیدی آرام سے ہیں مگر ہم قید میں بھی چپ نہیں ہیں۔ ہمارے جسم پر اپنے لوگوں سے وعدے کی تلوار لٹک رہی ہے۔ (بھٹائی)

مجھے زندہ موت کی دعوت دینے کیلئے اسلام آباد اور لاہور سے لے کر سارے ملک کے بدترین دماغ میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے، ان کا خیال تھا کہ میرے پاس کوئی بہت اہم اطلاعات ہیں جو انہوں نے معلوم کرنا چاہیں لیکن جناب میرے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر میرے پاس ایسی کوئی خاص اطلاعات ہوتیں بھی تو بھی میں انہیں کیسے دے دیتا۔ میرے خیال میں ایک تو وہ پاکستان میں امریکی جاسوس تھے اور دوسرے جناب! میں بڑا ڈانڈرس آدمی ہوں کوئی لیموں نہیں جس سے رس نچوڑ لیا جاتا۔ جناب! اخباروں میں کوئی خبر چھپتی ہے تو اسے اہمیت کیمطابق جگہ ملتی ہے لیکن ہمارے ملک پر امریکی ڈالروں سے گوشت پر پلتے ہوئے آدم خور بھیڑیوں کا راج ہے۔ انہوں نے شہریوں کو بے حساب مسئلوں کے جال میں لپیٹ لیا ہے یا پنجروں میں قید کرلیا ہے اور ہر دفعہ ان کو روکا گیا اور پھر لمبے عرصے تک اخبار پہ پابندی عائد کردی گئی۔ آخر سرکار اپنے ہی ہتھیاروں سے اتنا کیوں ڈرتی ہے؟ شاید اس لیے کہ اس نے اس سے پہلے جو بھی ہتھیار عوام کے خلاف اٹھایا ہے اس نے ان کی ہی جڑیں اکھاڑی ہیں۔ مثال کے طور پر بلدیاتی اداروں میں عوام دوست نمائندوں کا جیتنا اور غیر نمائندہ مجلس شوریٰ میں انتخابات کے مطالبے اعلیٰ عدالتوں میں ججوں کے استعفے اور اخباروں میں تنقید یہ سب کچھ کوئی اتفاقی حادثات تو نہیں، جناب! یہ سب کچھ عوام کی نفرت، جوش اور شکست نہ کھانے والے ردعمل کا اظہار ہے۔ یہ آخر ہونا ہے کہ وہ اپنے خلاف ہر اٹھتے ہوئے ہتھیار کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیں۔ شاید اسی ڈر سے حکومت راستوں پر گولیوں کے ہتھیاروں سے ہچکچا رہی ہے کہ شاید۔۔۔ خیر مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ سرکار یہ غلطی ضرور کرے گی۔ پھر خواہ خود ان کا ہی تخت الٹ جائے۔ یہ ان کی مجبوری ہے اور تاریخ کا مقرر کردہ ایک قدم بھی ہے۔

جناب! میں یہ سب کچھ اس لیے نہیں بتا رہا ہوں کہ میں کتنا ڈانڈرس آدمی ہوں بلکہ اس لیے کہ حالتیں بہت ڈانڈرس ہوگئی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ لوگ ہمارے بارے میں خبریں سننے کے پیاسے ہیں وہ کہتے ہیں کہ حکمران نہ صرف آدمیوں کی قوت سے بلکہ ان کے خیالات سے بھی ڈرے ہوئے ہیں اور وہ ہماری طرف سرخ سلام اس لیے بھیجتے ہیں کہ ہم ساری دنیا کے محنت کشوں کی طرح خود ان کے بھی ترجمان ہیں تو میں ڈانڈرس ہوں یا نہیں لیکن خود عوام بہت ڈانڈرس ہیں۔ لیکن اگر واقعی میں ڈانڈرس ہوں تو مجھے عوام کی عدالت میں آخری فیصلے کیلئے کیوں نہیں بھیجا جاتا؟ شاید اس لیے کہ ڈانڈرس عوام اپنا اعتماد مجھ پر دکھا چکے ہیں۔

کورٹ کے صدر اور ممبر صاحبان!

انہوں نے مجھے اعتماد کا قرب دیکر بڑا مان دیا ہے۔ میں تو ایک معمولی انسان ہوں کچھ زیادہ جانتا بھی نہیں، نہ کوئی اتنی صلاحیتیں ہیں لیکن جن ساتھیوں کے ساتھ ہوں وہ ہی عظیم ہیں۔ ان کی طرف سے عوام کی طرف سے بھی بے انتہا خلوص اور سچائی کی تسبیح میں ملا ہوا قرب اور یکجہتی ہی ہم کو ڈانڈرس بناتی ہے۔ شاید آپ کو یہ جستجو ہو کہ میں ان پتھریلے رستوں پر کیوں چلنے لگا ہوں۔

تو جناب! بات کچھ یوں ہوئی کہ سکھر کے ایک فوجی افسر نے بابا سائیں اور کنبے کے سارے مکینوں کو بلا کر ڈرایا اور دھمکیاں دی تھیں۔ میرے گھر کی عورتوں کی بے عزتی کی تھی جس کی وجہ سے میرے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اسی دوران میری ملاقات انقلابی رہنما کامریڈ جان ساقی سے ہوئی میں نے ان کو اپنی انتقام لینے والی خواہش بتائی۔ اس فوجی افسر کا نام بتایا جس سے میں بدلہ لینے کیلئے بے چین تھا مگر کامریڈ نے مجھے سمجھایا کہ اس معاشرے میں اس جیسے نجانے کتنے ہیں۔ تم کس کس سے انتقام لوگے؟ اس لیے نذیر عباسی کی شادی کے فوراً بعد گرفتاری کا بھی ذکر کیا جس کے نتیجہ میں اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس وقت مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کامریڈ جام ساقی آدمیوں سے بدلہ لینے کی بجائے معاشرے کو بدلنے کی ضرورت کی بات کرتے ہیں اور اس بات کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ یہ انہی الفاظ کا نتیجہ ہے کہ آج میں ایک خونی قاتل کی بجائے ذمہ دار سیاسی کارکن ہوں۔ لیکن اس کو کیا کہیے کہ حکومت مجھے انہی اسباب کی وجہ سے ڈانڈرس سمجھنے لگی ہے۔

شبیر شر (عدالتی بیان سے اقتباس)
کے، ایم، سی کمپلیکس کراچی
تاریخ 1 جنوری 1983ء

☆☆☆

میر تھیبو

ہمارے یہاں ایک عجیب قسم کا رویہ ہے کہ مرحومین اور شہید شخصیتوں پر لکھیں گے یا تقریریں کریں گے تو کچھ ایسی باتیں منسوب کرلیں گے جو اس نے کبھی بھی نہیں کہی ہونگی۔ ظاہر ہے کہ مرا ہوا انسان کسی بات کی تردید یا تصدیق بھی نہیں کرسکتا۔ حیدر بخش جتوئی کو بہت زیادہ انٹرنیشنل بنادیں گے اور پھر شہید نذیر عباسی کو قومی جدوجہد کا بھی ہیرو بنا کر کھڑا کردیں گے۔ حالانکہ نذیر کمیونسٹ پارٹی کے اندر قوم پرستی کے معمولی رجحانات کے خلاف بھی بہت بڑی نظریاتی جنگ لڑا کرتا تھا، سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو تو یہ ہے کہ کچھ دوست تو ٹارچر سیل کے متعلق بھی من گھڑت کہانیاں لکھ دیتے ہیں۔ یہ کہ نذیر نے ٹارچر کرنے والوں کو کہا تھا کہ ''مجھ سے میرا نام اگلوا کر دکھاؤ جبکہ میرا نام تم لوگ جانتے بھی ہو یا یہ کہ اس ٹارچر سیل میں نذیر کے خون سے اس کا نام لکھا ہوا تھا'' حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ جو لوگ بھی نذیر کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لوگ اسے کہاں لے جارہے ہیں۔ ہر ایک کو الگ الگ سیل میں رکھا گیا تھا کیونکہ نذیر کو جیسے ہی وہاں سے لے گئے تو پھر اسے واپس نہیں لایا گیا۔ نذیر سے کیا پوچھا گیا، اس نے کیا جواب دیے، اسے کیسے ٹارچر سے مارا گیا یہ کسی کو کچھ پتا ہی نہیں۔ یہ بات صرف ٹارچر کرنے والے ظالم ہی جانتے تھے یہاں تک کہ شہید کی لاش بھی کسی نے نہیں دیکھی بلکہ ایجنسی کے زیر نگرانی دفنادی گئی۔

فیض گھانگھرو نے قبرستان کے چوکیدار سے پوچھا جس نے بتایا کہ واقعی کچھ لوگ آئے تھے جو ایک آدمی کو دفنا کر گئے۔ کس کی میت تھی یہ مجھے پتہ نہیں۔ اس دن سے آج تک پارٹی سیکرٹری سے لے کر ممبر تک کسی کو پتہ نہیں کہ نذیر پر کیا گزری۔ بینظیر کے دور حکومت میں میں نے اسماعیل اوڈھیجو کو کہا کہ آپ نذیر کا کیس اوپن کرنے میں ہماری مدد کریں تو ان کا کہنا تھا کہ ہم اپنے شہید کا کیس اوپن نہیں کرسکتے تو نذیر کیس کیسے اوپن کرسکتے ہیں۔ نذیر کی شہادت کا قصہ تب ہی پتہ چل سکتا ہے جب کوئی ایسی جمہوری حکومت آئے جس پر خفیہ ایجنسی حکمرانی نہ کررہی ہو۔ ایسی جمہوری حکومت جو مجبور نہ ہو۔

یحییٰ خان کے مارشل لاء کے دور میں کراچی سینٹرل جیل میں تینوں تعلیمی اداروں ٹنڈو جام زرعی کالج، ایل ایم سی اور جام شورو انجینئرنگ کالج کے اہم طلبہ اور دوسرے مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے سیاسی لیڈر بھی تھے۔ مجھے حیدرآباد جیل سے بدلی کرکے کراچی لایا گیا۔ میں نے پہلی بار نذیر کو وہاں دیکھا، وہ فرسٹ ایئر میں پڑھتا تھا اور وہ آزاد ماروئڑا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی طرف سے گرفتاری دے کر آئے تھے۔ بیس سال کا ایک خوبرو نوجوان جو میرے ڈاکٹر رشید حسن خان، اعزاز نذیر اور ڈاکٹر ارباب کے درمیان چھڑے مباحثوں کو گہری سنجیدگی سے سنتا تھا۔ وہ مذاق بھی بہت زیادہ کرتا تھا۔ برصغیر کے مظلوم نوجوانوں کی طرح عاشقانہ اور دکھی گانے بھی گاتا تھا۔ جیل میں ایک قسم کی بیزاری ہوتی ہے جو آدمی کو باہر ہونے والی عام خفگی سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ جیل میں رہنے کے بعد آدمی میں چڑچڑاپن آجاتا ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے ساتھیوں سے خفا ہوجاتا ہے۔

جیل میں نذیر کو کبھی بھی میں نے بیزار یا خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ آخر میں کراچی جیل میں میرے اور نذیر کے علاوہ سب طالب علموں نے معافی نامے لکھ کر دیے اور آزاد ہوگئے۔ اس وقت آزاد ہونے والے ہمارے ساتھی جاتے ہوئے یہ بھی کہتے تھے کہ تمہیں کیا ہے تم لوگ پڑھو گے نہیں صرف تمہیں سیاست کرنی ہے۔ آپ جیسے یہاں ویسے ہی باہر، دونوں جگہ آپ کے لیے کوئی فرق نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر انجینئر بننا ہے۔ کچھ یہی بات کہ بھائی کیا کریں مجبوری ہے۔ نذیر کے ماروئڑا فیڈریشن والے ساتھی بھی معافی نامہ لکھ کر آزاد ہوگئے تھے۔ حالانکہ نذیر اس وقت مارکس وادی بھی نہیں تھا لیکن اس کی اپنی ذات سے سچائی اور اپنے ضمیر اور مقصد کے ساتھ کمٹمنٹ تھی۔ ظلم کے آگے جھکنے کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ کراچی جیل کا ہی ایک واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک دن سکیورٹی پرنٹنگ پریس کے مزدور لیڈر محمد یامین نے مجھ سے کہا کہ میرے ساتھ چلو ذرا جیل سپرنٹنڈنٹ کو آنکھیں دکھائیں کہ وہ ہمیں سہولیات کیوں نہیں دیتا؟ سپرنٹنڈنٹ بھی ایک ٹیڑھے مزاج کا آدمی تھا۔ منظور پنہور جانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ انکار کروں گا تو یہ مجھے بزدل سمجھے گا۔ میں معمولی جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ خیر ہم سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پہنچے وہ بھی پہلے سے غصے میں تھا۔ اس نے ایسا ڈانٹا کہ یامین آفس میں گر کر بیہوش ہوگیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے سپاہیوں کو حکم دیا اسے ہسپتال لے جایا جائے اور میرے لیے حکم دیا کہ مجھے بند وارڈ میں بند کیا جائے۔ لہٰذا مجھے بند وارڈ میں بند کیا گیا۔ ڈاکٹر رشید حسن خان، ڈاکٹر ارباب کھاوڑ اور دوسروں کو سکھر اور حیدرآباد جیل میں منتقل کردیا گیا۔ کراچی جیل میں صرف میں، نذیر عباسی، کامریڈ قادر طاہر (N.S.F) کا ایک میمن لڑکا بچ گئے تھے۔

نذیر نے بھوک ہڑتال کیساتھ ساتھ پانی پینا بھی چھوڑ دیا۔ شام تک نذیر کی طبیعت خراب ہوگئی، خشکی کی وجہ سے اس کا گلا بند ہوگیا۔ اس کی وجہ سے سپرنٹنڈنٹ ڈر گیا کہ لڑکے کو کچھ ہو ہی نہ جائے لہٰذا مجبوراً مجھے بند وارڈ سے نکالا گیا۔ تب جاکر نذیر نے پانی پیا۔ حالانکہ ہم تو بھوک ہڑتال بھی اچھی طرح نہیں کرسکتے۔ فرض کہ کسی بھی بڑے آدرش کے لیے جان دینا تو بڑی بات ہوتی ہے لیکن وہ ایک دوسری تنظیم کے قیدی کیساتھ فقط معمولی تکلیف ختم کرنے کے لیے جان دینے کے لیے تیار تھا۔ نذیر کو دیکھنے سے یوں لگتا تھا کہ اس نے مختصر زندگی میں بہت بڑے دکھ دیکھے ہیں مگر اس کا اظہار کبھی نہیں

شہید نذیر عباسی، شہید ذوالفقار علی بھٹو، شہید اسماعیل اوڈیجو

کرتا تھا۔ اس نے بہت زیادہ غربت کے دن دیکھے ہوئے تھے لیکن وہ اس کے باوجود ایک صحت مند خودداری کا مالک تھا۔ اسے جیل میں یہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ کوئی ملاقات کے لیے آتا ہے یا نہیں۔ میں 1972ء میں سیاست چھوڑ کر گاؤں چلا گیا تھا۔ نذیر بھٹو کے دور میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوا۔ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن ایس این ایس ایف میں کام کرتا تھا۔ ایک دفعہ میرے گاؤں آیا۔ تاج جویو بھی جی ایم سید کی ہدایت پر کسی سروے کے لیے نکلا تھا۔ رات کو بحث ہوگئی مجھے موضوع اچھی طرح یاد نہیں لیکن کچھ کمیونسٹ اور قوم پرستوں کے جھگڑوں کے بارے میں تھا۔ میری رائے تھی کہ کمیونسٹ اور قوم پرستوں کے جھگڑے بہت نقصان دہ ہیں۔ یہ کمیونسٹ کی ڈیوٹی ہے کہ وہ قوم پرستوں کو اپنے ساتھ ملائیں۔ ماضی میں سید کمیونسٹ اتحادی رہے ہیں۔ نذیر نے کوئی خاص رائے نہیں دی کیونکہ وہ بھی حال ہی میں کمیونسٹوں کا اتحادی بنا تھا۔ وہ صرف بحث سن رہا تھا۔ مجھے اس وقت یہ احساس نہیں ہوا کہ نذیر آگے چل کر Hard Liner بنے گا کیونکہ وہ دیکھنے میں نرم مزاج لگتا تھا۔ کسی بھی شخص کے بارے میں سرسری رائے نہیں دیتا تھا نہ ہی الزام تراشی کرتا تھا۔ کچھ لوگوں نے نذیر کو کہا کہ میر سید کا ساتھی بن گیا ہے جو بات اس نے نہیں مانی۔ میری نذیر سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی تھی۔ حیدرآباد میں روزی کارنر میں میں آتا تھا۔ اس کی میرے مرحوم بھائی مختار سے بحث ہوا کرتی تھی، میں بالکل نہیں کرتا تھا۔ میرا اس وقت مجموعی طور پر زندگی کی طرف رویہ With Draw کی طرح کا ہوتا تھا۔ 1978ء کا ایک دل دکھانے والا واقعہ مجھے یاد ہے۔ نذیر کو انٹرنیشنل ہاسٹل کے میدان میں جیئے سندھ کے فنکشن میں اسکے بال نوچے گئے اور پٹائی بھی کی گئی۔ جس کے بعد مجھے وہ سندھ یونیورسٹی ملا تھا۔ مجھے اس نے خود نہیں بتایا کہ ایس این ایس ایف کے طالب علم نے بتایا۔ میں نے اس سے اس بات کی تصدیق کی تو اس نے کہا "ہاں" میں نے اس کے چہرے کو افسوس اور دکھ سے دیکھا لیکن اس کے چہرے پر نہ افسوس تھا نہ ڈر نہ کوئی بے عزتی کا احساس تھا بلکہ ایک قسم کا ایسا تاثر دے رہا تھا کہ انقلابیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اکثر اس کے منہ سے یہ بات کہتے ہوئے سنی کہ "دنیا کی کوئی بھی طاقت یہاں پر کامریڈوں کو پہنچنے سے نہیں روک سکتی" یہ کہہ کر پھر وہ ہنسنے لگتا تھا۔

لہٰذا 1979ء میں پھر سے پارٹی میں شامل ہوگیا۔ مگر چونکہ اس وقت پارٹی میں زیادہ ڈسپلن چلتا تھا اور جمال نقوی کی ہی زیادہ تر چلتی تھی۔ نذیر اگر پارٹی میں سب سے زیادہ متاثر تھا تو وہ جمال نقوی سے ہی متاثر تھا۔ اس لیے مجھے نذیر نے بتایا کہ پارٹی نے طے کیا ہے کہ کیونکہ تم پارٹی چھوڑ کر پھر سے دوبارہ آئے ہو اس لیے تمہیں گروہ میں بٹھاتے ہیں اور تمہارا گروپ صالح بلو سے بناتے ہیں کیونکہ تم دونوں ایک ہی سیاسی محاذ پر کام کر رہے ہو۔ اس کا انچارج نذیر خود بنا، اس وقت نذیر مرکزی کمیٹی کا ممبر اور سندھ صوبائی کمیٹی کا سیکرٹری تھا۔ مجھے پہلے اس بات کا احساس نہیں تھا کہ نذیر اتنی جلدی اوپر تک پہنچ گیا ہوگا وہ انچارج ہوتے ہوئے بھی خود پر ڈسپلن لاگو کرتا تھا اور دوسروں پر بھی اس کے لیے سختی برتتا تھا جبکہ دوسرے انچارج صرف دوسروں پر ڈسپلن لاگو کرواتے تھے۔ نذیر پارٹی، نظریے اور انقلاب کو اپنے گھر اور بچوں سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ ایک بار اس کی چھوٹی بیٹی (جو اسے اپنی جان سے زیادی عزیز تھی) زرقا بہت بیمار ہوگئی کیونکہ پیسے نہیں تھے۔ حالانکہ پارٹی کے پیسے اس کے پاس تھے لیکن اس نے اپنی ذاتی ضرورت کے باوجود پارٹی کے پیسے استعمال نہیں کیے۔ اپنی ذات و بچوں کے بجائے پارٹی کا کام بہت زیادہ کرتا تھا۔ دونوں صورتوں میں وہ زرقا کا علاج نہیں کرواسکا۔ میٹنگ

میں کبھی بھی دیر سے نہیں آتا تھا نہ ہی غیر حاضر رہتا۔ سچ کتنا بھی کڑوا ہو بول دیتا تھا پھر کسی کو اچھا لگے یا برا۔ پارٹی لیڈر ہونے کے باوجود دکھاوا نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا۔ دانشور تو نہیں تھا لیکن مارکس اور لینن کا بہت مطالعہ رکھتا تھا جو اس کی گفتگو اور بحث سے چھلکتا تھا۔

ایک دن سی ایس ایس آفیسر نے مذاق ہی مذاق میں نذیر سے پوچھا کہ Matter in Motion کو فلسفے کی روشنی میں سمجھاؤ۔ نذیر ایک ہونہار طالب علم کی طرح سمجھاتا گیا۔ نذیر کارکنان کی نظریاتی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دیتا تھا۔ انقلابیوں کی تدریسی پڑھائی کو غیر اہم سمجھتا تھا۔ ضلعی کمیٹی میں امداد چانڈیو سے بحث ہوگئی۔ اس وقت مجھے بھی جلدی پروموشن دے کر حیدرآباد کی ضلعی کمیٹی میں لایا گیا تھا۔ امداد چانڈیو پروارنٹ تھے اس لیے نذیر نے کہا کہ درست نہیں تم کلاس اٹینڈ کرنے مت جاؤ۔ اس پر امداد نے کہا کہ طالب علم کو پڑھنا بھی چاہیے آخر کار ڈگری بھی تو لینی ہے، اس پر نذیر نے ٹوک کر کہا انقلاب کے بعد یہ ڈگریاں کام آئیں گی کیا؟ بہرحال امداد کا خیال تھا کہ گرفتار ہونا ہو تو ہو جاؤں مگر کلاس ضرور اٹینڈ کروں گا۔ نذیر میں کسی قسم کا کوئی کمپلیکس نہیں تھا۔ مڈل کلاس سے اس کی بالکل نہیں بنتی تھی۔ اس کلاس کے ہمدردوں اور چندہ دینے والوں کے پاس مجھے بھیجتا تھا کہتا تھا کہ ان کو تم جانو، اس کے دور میں مڈل کلاس کے لوگ بہت کم ہوتے تھے۔ پارٹی اور ذیلی تنظیم کو ہمیشہ فعال رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بہت بااخلاق اور اعلیٰ اقدار کا مالک شخص تھا۔ ورکر کے دکھ سکھ کا بہت خیال رکھتا تھا لیکن خوش مزاج ہونے کی وجہ سے گالیاں دیتا اور جس کی ایک دفعہ کامریڈ گھنشام پرکاش نے اوپر تک شکایت بھیجی۔ نذیر کہتا تھا کہ زندگی اتنی خشک ہے کہ مذاق اور گالی برائے مذاق بھی نہیں دیتے تو پھر تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ روپوش زندگی کے اصولوں پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ روپوش تو ہم میں سے اکثر رہتے ہیں لیکن وہ بغیر پیسوں کے بھی گزارا کر لیتا تھا۔ نذیر کو سنیما میں فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ روپوشی کے دنوں میں بھی فلمیں دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اپنی بیوی اور بیٹی سے بہت پیار کرتا تھا مگر اس کا اظہار کبھی نہیں کیا کرتا تھا۔ زرقا فلم اسے بہت پسند تھی اور اس لیے یہ فلم کئی مرتبہ دیکھی۔

فلم میں زرقا کردار سے متاثر ہو کر اپنی بیٹی کا نام زرقا رکھا۔ لیڈرشپ میں وہ واحد انسان تھا جس کے جذبے اور باتوں سے لگتا تھا کہ یہ انسان انقلاب لائے گا یا راہ میں مارا جائے گا۔ کئی ایسے مواقع آئے کہ ہمیں ڈر لگتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں کبھی ڈر نہیں دیکھا حالانکہ قلی کیمپ میں بقول اسکے کہ آخری وارننگ دی تھی کہ اگر پھر پکڑے گئے تو جان سے ماردیں گے اور ان کی وارننگ کو نذیر سچ جانتے ہوئے بھی کام کرتا رہا۔ کچھ ماہ بعد مجھے صوبائی کمیٹی کے لیے چنا گیا۔ ہمارے پاس ہر کامریڈ کو اس وقت پارٹی انچارج اور اوپری کمیٹی کی سفارش پر چنا اور سلیکٹ کیا جاتا تھا۔ الیکشن نہیں ہوتے تھے بلکہ سلیکشن ہوتی تھی اور صوبائی کمیٹی میں اس وقت چار ممبران تھے ایک جاوید شکر دوسرے چاچا مولا بخش، تیسرے رمضان میمن اور میں۔ نذیر اس کمیٹی کا سیکرٹری تھا۔ پورے سندھ کا چرخہ چلانے کے لیے معمولی معیار کے کامریڈ دیکھ کر مایوسی ہوئی مگر پورے سندھ کی پارٹی کے کل 50 ممبر تھے۔ ویسے بھی پارٹی کا سارا کام نذیر کیا کرتا تھا۔ نذیر عام زندگی میں جتنا نرم دل تھا اتنا پارٹی معاملات میں سخت ہوا کرتا تھا کہ پارٹی کے لحاظ سے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بھی رعایت نہیں کرتا تھا۔ نذیر اپنی سوچ میں کبھی بھی الجھا ہوا نہیں تھا وہ نیشنلزم کے سخت مخالف تھا۔ کہتا تھا کہ میں قوم پرستی کی وجہ سے پارٹی میں شامل نہیں ہوا بلکہ طبقاتی فکر کی وجہ سے پارٹی میں آیا ہوں۔ پنجاب میں نذیر کی پروگریسو جئے سندھ سے قومی مسئلے پر بحث ہوئی۔ پروگریسو کے نمائندگان نے سندھ میں آکر کہا کہ نذیر عباسی تو قوموں کو مانتا ہی نہیں۔ نذیر نے کہا کہ میں تو بابائے پاکستان کے بعد پیدا ہوا ہوں اس لیے میں پاکستانی ہوں۔ نذیر اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ہر مسئلے کو مزدور طبقے کے نقطہ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ بالادست قوم کا پرولتاری کبھی مظلوم قوم کے پرولتاری کا استحصال نہیں کرتا۔ یہ پرولتاریہ کی پارٹی ہے، مزدوروں کو قوموں میں تقسیم نہیں کرنا چاہیے۔ ایک موقع پر ایس این ایس ایف کے شاگردوں نے فیصلہ کیا کہ جیئے سندھ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مخالفت کے باوجود سندھ یونیورسٹی آڈیٹوریم میں کامریڈ حیدر بخش جتوئی ڈے کا انعقاد کیا جائے۔ اس موقع پر کراچی سے جاوید شکور بھی پروگرام میں شرکت کی غرض سے وہاں پر آئے اور آکر بتایا کہ پارٹی کا یہ فیصلہ ہے کہ میں یہاں پر تقریر کروں جس پر نجن کمار اور امداد چانڈیو نے مخالفت کی کہ یہاں کا ماحول قوم پرستی کا ہے اور کسی مہاجر کو تقریر کرنے نہیں دیں گے۔ جیئے سندھ والے ہنگامہ کردیں گے۔ کچھ دن بعد نذیر اوپر سے کمیٹی کا فیصلہ لے کر آیا کہ پارٹی آپ سے جواب طلب کرتی ہے اور سخت تنقید کرتی ہے کہ قوم پرستی کے سیلابی بہاؤ میں بہہ گئے ہو۔ امداد خاموش ہوگیا اور الٹا اس بات پر ڈٹ گیا کہ ہم نے کون سا غلط کام کیا ہے۔

ہم درست ہیں، کامریڈ نذیر کا خیال تھا کہ کمیونسٹ اور قوم پرست ایک ہی ہیں ان میں کون سا فرق ہے۔ اس دور میں پارٹی میں قوم پرستوں پر سخت تنقید ہوتی تھی اس لیے پارٹی میں قوم پرستی کے معمولی رجحان کو بھی برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ کہتے تھے کہ ہم پہلے کمیونسٹ ہیں پھر سندھی ہیں۔ نذیر ماسکو لائن کا حامی تھا مگر کہتا تھا کہ اپنے ملک میں کام بڑھاؤ تو ماسکو بھی آپ کو تسلیم کرے گا اور دنیا بھی۔ نذیر ماسکو ریڈیو پر غیر معیاری پروپیگنڈا پر بھی تنقید کرتا تھا اور کبھی کبھی ماسکو والوں پر بھی تنقید کرتا تھا۔ سوویت یونین کبھی نہیں گیا اگر جاتا تو ان کے دیمک زدہ، اندرونی معاملات پر اچھی خاصی تنقید کرسکتا تھا۔ نذیر خواہ مخواہ کی جھوٹی تعریف کے سخت مخالف تھا۔ خود پر تنقید بھی کرتا تھا۔ اپنی پارٹی کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ اس نے انقلاب آنے کی تاریخ کبھی نہیں دی۔ پارٹی کی اندرونی خامیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ لوگوں کو پارٹی میں لانے کے لیے کبھی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کرتا تھا۔ پارٹی کے مخالفین کا دشمن ہوتا تھا مگر اس کے باوجود اس کی زندگی میں ہی دوسری پارٹیوں کے لوگ اس کے جذبے، کام، خلوص اور سنجیدگی سے متاثر تھے۔ پارٹی سے بہت پیار کرتا تھا۔ نذیر کی اس وقت جو بھی سوچ تھی اس کے ساتھ سچائی سے پرخلوص تھا۔ آج بھی نذیر کی شخصیت ہم سب سے اوپر اعلیٰ مقام پر کھڑی ہے۔ ہم اس کے سامنے چھوٹے ہیں۔ شہید کو کسی گروہ بندی میں نہیں بانٹا جاتا۔ نذیر ظلم کے خلاف لڑنے والے سب مظلوموں کا شہید اور ہیرو تھا۔

☆☆☆

حکمرانی کے اندھے شوق اور اجتماعی مفاد سے احمقانہ دشمنی کے تحت محض فوجی طاقت کے زعم میں اپنے ہی ملک کو فتح کر کے ''فیلڈ مارشل'' بن بیٹھنے والے ملک کے پہلے پاکستانی سپاہ سالار جنرل ایوب خان اور قائد اعظم محمد علی جناح کے پاکستان کو توڑ دینے والے دوسرے مارشل لاء کا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد یحییٰ خان کے بعد مشرقی پاکستان کی جنگ ہار کر ہندوستان کی قید میں چلے جانے والے نوے ہزار سے زیادہ جنگی قیدیوں کو رہا کرا کے وطن واپس لانے والے ملک کے پہلے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ کر انہیں عدالتی قتل کے ذریعے پھانسی پر لٹکانے کا شوق پورا کرنے کے بعد افغانستان کے امریکی جہاد میں اجرتی قاتل کا کردار ادا کرنے کے دوران اپنے ملک کے بے گناہ عوام اور سیاسی کارکنوں کی ننگی پیٹھوں پر کوڑے برسانے کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے اور ان کی چیخوں سے عزت حاصل کرنے کی درندگی میں مبتلا تیسرے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق کے انتہائی ظالمانہ مارشل لاء کے دوران بائیں بازو کے مارکسی نظریات کی پیروی میں محنت کشوں کے حالات کار بہتر بنانے کے دوران بائیں بازو کے مارکس نظریات کی پیروی میں جدوجہد اور جابر سلطان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارنے کے جرم میں جیل کی سلاخوں کے اندر فوج کے بے پناہ تشدد کے تحت شہادت پانے والے سرکردہ مزدور رہنما نذیر عباسی شہید کی زندگی کی ساتھی کامریڈ حمیدہ گھانگھرو نے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہوئے قومی عوامی تاریخ کے اس اہم ترین مرحلے کی یادوں کو محفوظ کرنے کا قابل قدر فریضہ سرانجام دیا ہے۔

بلاشبہ ایسی انقلاب آفریں عوامی تحریک اس قدر نڈر اور سچے جذبوں کے ساتھ اس انداز میں اس خطے نے پہلے کبھی دیکھی نہیں ہوگی جس نے دشمن عزیز کو سرخ رنگ کی پگڑیوں اور لال دوپٹوں کے سمندر میں تبدیل کر دیا تھا۔ نذیر عباسی جیسے خالص نظریاتی لوگوں نے اس تحریک کو اپنے اصلی خون کے آخری قطرے سے لالہ فام کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ

یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ
سن رکھو اک زمانہ ہیں یہ لوگ

کامریڈ حمیدہ گھانگھرو خود ایک محنت کشوں کی قیادت کرنے والے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں جو ہاری کمیٹی کے ایک رہنما کے گھر پیدا ہوئیں، اور والدین کی نظریاتی تعلیم اور عملی تربیت اور تجربے کی بناء پر زمانہ طالب علمی کی ابتداء سے ہی طلبہ تحریک میں سرگرم ہو گئیں۔ آٹھویں جماعت کی طالبہ تھیں جب طلبہ یونین کی سیکرٹری جنرل منتخب ہوئیں اور اپنے سکول کو کالج کا درجہ دلوانے کی تحریک کا آغاز کیا اور پہلی مرتبہ اپنی ہمشیرہ زبیدہ کے ساتھ 1975ء میں جیل گئیں۔ آخری وقت تک سکول کو کالج بنانے کی تحریک میں ڈٹی رہیں۔ کامریڈ حمیدہ نذیر عباسی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے سے پہلے سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے مرکزی عہدیدار کے فرائض بھی سرانجام دیتی رہی ہیں۔

ٹنڈو الہ یار میں ایک سرکاری ملازم کے ہاں 1953ء میں جنم لینے والے نذیر عباسی بچپن سے ہی بہت ذہین اور حساس تھے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ ''آزاد مارو بڑا اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' کی طرف سے بھوک ہڑتال میں حصہ لینے کے جرم میں جیل گئے۔ جہاں کمیونزم کے نظریات رکھنے والے سیاسی کارکنوں سے ملاقات ہوئی۔ جیل سے باہر آ کر جام ساقی سے ملاقات کی اور باقاعدگی سے کمیونسٹ پارٹی کی ذیلی طلبہ تنظیم ''ایس این ایس ایف'' میں کام کرنے لگے۔ اگرچہ ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں نذیر عباسی کی ماں اور بہنوں کو بھی گرفتار کر کے تھانے میں لایا گیا تھا مگر بائیں بازو کے نظریاتی سیاسی کارکن کے طور پر انہوں نے بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بینظیر بھٹو کی گرفتاری کے خلاف شدید احتجاج کرتے ہوئے اسے شرمناک انتقامی کارروائی قرار دیا تھا۔

نذیر عباسی کا شادی کے بعد کی عملی زندگی کا بیشتر حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے یا روپوشی کے دوران سیاسی جدوجہد میں گزرا ہے۔ 1978ء میں شادی کے بعد نذیر اور حمیدہ دونوں ''ایس این ایس ایف'' کی جانب سے پٹ فیڈر بلوچستان کی کسانوں کی تحریک میں سرگرم رہے۔ کامریڈ حمیدہ کو پارٹی نے بھوک ہڑتال میں حصہ لینے کے لیے کہا اور انہیں اپنی سنیئر رکن آصفہ رضوی کے ساتھ ٹیپل ڈیرہ میں بھوک ہڑتال کے دوران گرفتار کیا گیا اور وہ تین ماہ مچھ جیل میں بند رہیں۔ اس دوران نذیر کو خبردار کیا گیا کہ آئندہ پکڑے گئے تو زندہ رہنے نہیں دیا جائے گا۔ ایک نظریاتی انقلابی کارکن کے طور پر نذیر عباسی دھمکیوں سے متاثر نہیں ہو سکتے تھے۔

کامریڈ حمیدہ مچھ جیل سے رہا ہوئیں تو نذیر عباسی ایک بار پھر گرفتار ہو چکے تھے۔ ان کے لیے ہائی کورٹ میں حبس بے جا کی اپیل کی گئی اور پورے ملک میں احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا۔ چھ ماہ بعد نذیر عباسی کوئٹہ قلی کیمپ سے رہائی کے بعد روپوش ہو گئے اور اس دوران سیاسی سرگرمیاں اپنے عروج کو پہنچیں۔

جام ساقی کی رہائی کے لیے ریگل چوک کراچی کے مظاہرے کے دوران کامریڈ حمیدہ کو تیسری مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ سکھر جیل سے رہائی کے وقت ملکی حالات بہت مشکلات سے دوچار ہو چکے تھے۔ جنرل ضیاء کی آمریت بائیں بازو کی سیاست کا مکمل خاتمہ چاہتی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو پھانسی پر لٹکائے جا چکے تھے۔ 9 اگست 1980ء کو نذیر عباسی کو شدید تشدد کے ذریعے شہید کیا گیا اور برلن کی دیوار کے گرائے جانے اور سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد مارکسزم، لینن ازم، سوشلزم کی اس اصلی تحریک کے آثار نمایاں ہونے لگے جو پورے عالم انسان میں سرطان کی طرح پھیلنے والی بربریت کو انسانیت میں بدلنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس تحریک میں حصہ لینے کے لیے ماضی کی عوامی تحریکوں کے قریبی مطالعہ کی ضرورت ہے اور کامریڈ حمیدہ گھانگھرو کی یادیں اس سلسلے کی سب سے نمایاں عوامی اور مزدور تحریک سے روشناس کراتی ہیں۔ کامریڈ حمیدہ کے سادہ اور پرخلوص انداز تحریر سے ان یادوں سے اپنائیت، سچائی اور نظریاتی پختگی کی خوشبو ملتی ہے۔ ☆☆☆

ملٹی نیشنل کمپنیاں 1997ء ایکٹ کی خلاف ورزیاں کر رہی ہیں

محترم ایڈیٹر،

ویسے تو پورے ملک میں خاص کر سندھ کے ہر کونے کوچے میں ظلم ہے۔ جس معاشرے یا سماج میں کرپشن، سفارش، نااہلی، بھوک بدحالی، بیروزگاری، اقربا پروری، پولیس کی زیادتیاں، تعلیم کا فقدان، استحصالی قوتوں کا سرعام استحصال، جبری مشقت، اغواء برائے تعاون، قومی خزانہ پر چند افراد کا قبضہ، حصول انصاف مشکل ہو، عوام کی قسمت کے مالک صرف اور صرف حکمران مطلب مسئلے ہی مسئلے ہوں، ایک بحران ختم دوسرا بحران شروع ہو جائے وہاں تو انقلاب آتے ہیں۔

لیکن سندھ کی صورتحال پوری دنیا سے الگ ہے۔

یہاں کے باشندے ظلم برداشت کرتے کرتے ظلم سہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہاں اگر کوئی بھی ان زیادتیوں، ظلموں کے خلاف آواز بلند کرے تو وہ یا قتل ہو جاتا ہے یا اغواء ہو کر گم (غائب) کیا جاتا ہے یا کسی جعلی FIR میں اس کا نام درج کر کے حوالات کے حوالے ہو جاتا ہے۔ اس کی فائل بڑی فائلوں کے نیچے دب جاتی ہے اور وہ حصول انصاف کے لیے سالوں تک تڑپتا رہے گا۔ افسوس تو یہ ہے کہ جس سے انصاف مانگنا ہے وہ ہی تو ظلم کر رہا ہے تو پھر دادرسی کہاں سے ہوگی!

ہمارے ضلع گھوٹکی کو صنعتی زون کا درجہ دیا گیا ہے۔

ہمارے قادر پور گیس فیلڈ، ماڑی گیس فیلڈ، تلو گیس فیلڈ، رحمت گیس فیلڈ، جھارو گیس فیلڈ، ایف ایف سی فرٹیلائزر فیکٹری میر پور ماتھیلو، FFC ڈھرکی اینگرو انرجی پاور پلانٹ ڈھرکی، اینگرو انرجی پاور پلانٹ گھوٹکی، شوگر مل گھوٹکی، شوگر مل گھوٹکی خان گڑھ اور اسٹیل ملز لگنے والی ہے۔ بہت سے لاتعداد کاٹن فیکٹریاں رائس ملز فلور ملز ہیں۔

لیکن ضلع گھوٹکی میں غربت انتہائی زیادہ ہے۔

60 فیصد سے زیادہ عوام غربت کی حد سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ 70 فیصد سے زیادہ لوگ ان پڑھ ہیں۔ 80 فیصد سے زیادہ لوگ صحت کی بنیادی سہولیات سے محروم ہیں۔ 70 فیصد سے زیادہ کچی سڑکیں ہیں۔ روڈ بھی نہیں ہیں۔ 90 فیصد ضلع کے لوگ بیروزگار ہیں۔ 100 فیصد گاؤں گیس کی سہولت سے محروم ہیں۔ شہروں میں گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ ملیریا عام ہے، ہیپاٹائٹس ہر تیسرے بندے کو ہے۔ 90 فیصد عورتیں زنانہ بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ 30 فیصد سے زیادہ عورتیں دوران زچگی فوت ہو جاتی ہیں۔ بچوں میں خوراک کی کمی ہے۔

یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ جاگیردارانہ سماج و ڈیرا شاہی، سرداری سسٹم نے سب مفلوج کر رکھا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں وڈیروں کو ہر سہولت دیتی ہیں ان کو پیسہ روپیہ گاڑیاں دے کر عوامی حقوق کا سرعام استحصال کر رہی ہیں۔ ہمارے ضلع میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں۔ سب کچھ وڈیرا، سردار، رئیس ہیں۔ وہ عوام کو الجھائے رکھنے کیلئے قبائلی جھگڑے کرواتے رہتے ہیں۔ لوگ آپس میں لڑتے رہتے ہیں لہٰذا اپنے حقوق نہیں مانگتے اور اس کو زیادہ تقویت دینے میں خود ملٹی نیشنل کمپنیاں ملوث ہوتی ہیں جو سرداروں کو پیسہ دیتی ہیں۔ سردار اسلحہ خرید کر ان لوگوں کو دیتے ہیں جس سے قبائلی جھگڑوں میں لوگ روز مرتے رہتے ہیں۔

کچھ کمپنیاں اپنے معاہدوں سے انحراف کرتی ہیں۔

معاہدہ پیٹرولیم کنسیشن ایگریمنٹ (PCA) جس میں واضح ہے کہ مقامی لوگوں کو روزگار، سماجی سہولتیں، تعلیم، صحت، علاقہ کی سماجی ترقی ان کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ 12 فیصد رائلٹی اس کے علاوہ ہوتا ہے، پراڈکشن بونس الگ ہوتا ہے جو علاقے کی ترقی کیلئے ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ضلع گھوٹکی میں یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں کچھ بھی نہیں کر رہی ہیں۔ الٹا ماحولیاتی آلودگی پھیلا کے ماحول کو خراب کر رہی ہیں۔ ہمارے ضلع میں پہلے باغات ہوا کرتے تھے جو بہت اچھا پھل دیتے تھے اور ان کمپنیوں کی آلودگی کی وجہ سے یہ پھل اور باغات تباہ ہو گئے ہیں۔

ہمارے پانی میں بھی زہر ہے یعنی سینکو ہو گیا ہے۔

لوگوں میں خارش، آنکھوں کی بیماریاں عام ہیں۔ بہت سی مائیں اپنے بچوں کا علاج کروا کروا کر تھک گئی ہیں۔ اب فصل نہیں ہو رہی ہے۔ زراعت تباہ ہو گئی ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں 1997ء ایکٹ کی خلاف ورزیاں کر رہی ہیں۔

حکومت کے تیل گیس کے رہنما اصول مرتب ہیں

لیکن ضلع گھوٹکی کے عوام ان پڑھ اور خوف زدہ پولیس کے خوف، سرداروں کے خوف سے ڈرے ہوئے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر اپنے حقوق سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ عوامی شعور کی کمی کی وجہ سے اور آپس میں اختلاف سے ملٹی نیشنل کمپنیاں اور سردار فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ فائلوں میں سب کچھ دکھایا گیا ہے لیکن عوام وہیں کے وہیں ہیں۔ نہ ہمارے علاقے کو ترقی ملی نہ روزگار ملا، نہ انصاف ملا، نہ وصال صنم۔ ہم ہر روز بروز بیماریوں میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں اور یہ مسئلے ہمارے صدیوں تک جاری رہیں گے۔ پورا معاشرہ بیمار ہو جائے گا ماحول خراب ہو جائے گا۔ زرعی زمین بنجر بن جائے گی کہ سیاسی سماجی معاشرتی تباہی ہو جائے گی اور آخر میں یہ کمپنیاں اپنے مقاصد حاصل کر کے واپس چلی جائیں گے۔ ہم قرضوں کے عذاب میں پوری نسل کو رکھیں گے۔

ہم چاہتے ہیں سوچنے والے سندھی قوم جاگ جائیں اور اپنے سماجی اختلافوں کو ختم کر کے ایک ہو جائیں۔ اپنے حقوق کی جدوجہد کریں گے تبھی ہمارے حقوق واپس ہمیں ملیں گے۔

محمد اعظم چاچڑ
گھوٹکی سندھ

......☆......

فیض نامہ

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیٔ گلفام
وہ عکسِ یار سے لہکے ہوئے ایام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا امید کا ہنگام

☆

مزدور جدوجہد قارئین کے خطوط نیک نیتی کے تحت شائع کرتا ہے۔ خطوط میں بیان کئے گئے شواہد خیالات، واقعات کی ذمہ داری ادارہ قبول نہیں کرتا۔ تمام خطوط خوش خط اور صفحے کی ایک جانب تحریر کئے جائیں ___ ایڈیٹر

1956ء کا آئین کیسے بنا

ہمارا ملک طویل عرصے تک بغیر آئین کے رہا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ سیاسی رہنما آئین بنانا نہیں جانتے تھے۔ بی اے کا ایک عام طالب علم ایک گھنٹے میں آئین آسانی سے تیار کر سکتا ہے۔ آئین تشکیل نہ دینے کی کئی وجوہات ہیں۔ خصوصاً وہ واقعات جو 1953ء اور 1955ء کے درمیان پیش آئے۔ آئیں جائزہ لیں کہ وہ کون سے واقعات تھے۔

1953ء میں جب ملک کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین (بنگالی) اور گورنر جنرل غلام محمد تھے۔ ان دنوں نوکر شاہی کے نمائندے غلام محمد کے قبضے اور کنٹرول سے باہر نکل کر وزیر اعظم نے بنگال کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا اور آئین بنانے کیلئے سرگرم ہو گئے۔ غلام محمد جو پورے ملک کے قبضے کا خواب دیکھ رہے تھے، نے ناظم الدین کو اقتدار سے باہر کرنے کی سازش کی۔ انہوں نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ ممتاز دولتانہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کی کہ پنجاب میں قادیانیوں کے خلاف ہنگامے کئے جائیں اور ناظم الدین کی وزارت میں شامل واحد قادیانی وزیر سر ظفر اللہ خان کی چھٹی کر کے اور آئین کا معاملہ ایک طرف کر کے ناظم الدین کی وزارت توڑ دی جائے۔

مختلف طریقے استعمال کر کے ہنگامے کروائے گئے۔ یہ ہنگامے قابو سے باہر ہونے لگے تو فوج کو لاہور میں مارشل لاء لگانے کا حکم دے دیا گیا۔ فوج نے مارشل لاء لگا کر حالات پر تو قابو پا لیا لیکن اس کے بدلے میں اقتدار میں حصہ مانگا۔ چنانچہ ایوب خان کو وزیر دفاع بنا دیا گیا۔ بعد میں جب ایوب خان کو وزارت چھوڑنے کیلئے کہا گیا تو اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کیلئے مالی فائدوں کا مطالبہ کیا۔ یہ فائدے زمینوں کی صورت میں دیئے گئے۔ حقیقت میں زمینوں کی الاٹمنٹ ہی 1958ء کے مارشل لاء کی بنیاد بنی۔

1954ء میں (مشرقی) بنگال میں انتخابات ہوئے جن میں حکمران مسلم لیگ کو صرف 9 سیٹیں ملیں جبکہ متحدہ محاذ (جگتو فرنٹ) نے 301 سیٹیں جیت لیں۔ بنگال میں جگتو فرنٹ کی حکومت کو ابھی چھ ماہ بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ وہاں گورنر راج لگا دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بنگالی رہنماؤں سے کہا گیا کہ وہ جب تک قومی اسمبلی میں آبادی کی بنیاد پر نشستوں کے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوتے اور پیریٹی Parity کا اصول (یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان میں برابر برابر سیٹیں، جس کیلئے مغربی حصے میں ون یونٹ بھی لگایا گیا) تسلیم نہیں کرتے، اس وقت تک آئین نہیں بنایا جائے گا۔ جب بنگال کے کچھ رہنماؤں (عوامی لیگ) نے یہ بات منظور کر لی تو اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کیلئے 1954ء کے اواخر میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی گئی کیونکہ یہ بات یقینی تھی کہ کمیونسٹ پارٹی ہی وہ واحد ملک گیر جماعت ہے جو اس قسم کے منصوبوں کی مخالفت کرے گی۔

بہر حال اس کام کو تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے ون یونٹ لگا دیا گیا اور بعد ازاں ہمیں مشہور زمانہ 1956ء کا ون یونٹی آئین تحفے میں ملا۔

(اقتباسات)

حوالہ: سندھی روزنامہ 'عوامی آواز' 18 جولائی 2001

weekly MAZDOOR Lahore
JEDDOJUHD

LRL No. 208

کھلا خط!

محترم! - - - - - - - - -

سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (SNSF) کے مرکزی صدر بعد ازاں یونین آف اسٹوڈنٹس کے وائس چیئرمین اور مزدور کسان طلباء عوامی رابطہ کمیٹی کے رہنما جناب نذیر عباسی کو فوج کے فیڈرل انویسٹیگیشن یونٹ اور پولیس کے کارندوں نے 30 جولائی ۱۹۸۰ء کو کراچی سے گرفتار کیا۔ گرفتاری کے بعد انہیں ملیر کینٹ کے فوجی تفتیش کے مرکز میں ۹ اگست ۱۹۸۰ء تک بہیمانہ تشدد اور بے دردی کے ساتھ اذیتیں پہنچا کر قتل کر دیا۔

نذیر عباسی شہید آخری دم تک اپنے وطن کے سارے دکھی انسانوں اور کچلے ہوئے طبقوں کو اندرونی اور بیرونی استحصال، استعمار اور آمریت سے نجات دلانے کی خاطر بار بار متعدد بار قید و بند اور فوجی تفتیشی مراکز میں صعوبتیں برداشت کرتا رہا اور اپنے آدرشوں کی تکمیل کی راہ میں اپنی جان قربان کر دی۔

مجھے فخر ہے کہ میری شادی ہماری دھرتی کے ایک ایسے سپوت سے ہوئی تھی جو انسان دوست تھا۔ منافقت اور جبر کے خلاف برسرپیکار تھا جو سامراجی قوتوں کے ہتھکنڈوں کو کچلنا چاہتا تھا۔ اور اپنے ملک سے اندھیرا ختم کر کے اجالا لانے کا خواب پورا کرنا چاہتا تھا۔ ناشناس درندے اس دھرتی کو سنوارنے کی جدوجہد کرنے والوں کو بے دردی سے قتل کر کے اور انہیں وحشیانہ جبر و تشدد روا رکھ کر شاید اس خوش فہمی میں ہیں کہ اس طرح ان کے فرسودہ نظام کی عمر شاید کچھ اور بڑھ جائے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ نذیر عباسی شہید کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب ہوگا۔

میں ملک کی تمام جمہوری قوتوں اور اس ملک سے سامراجی استحصال کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کرنے والی تمام ترقی پسند، روشن خیال اور باضمیر تنظیموں اور افراد سے اپیل کرتی ہوں کہ وہ اس ظلم اور بے رحم جارحیت کے خلاف اور ان اعلیٰ مقاصد کو منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوں جن کی تکمیل کے لیے نذیر عباسی شہید نے اپنی جان قربان کر دی۔

دستخط

(حمیدہ گھانگھرو)

منجانب: حمیدہ گھانگھرو
بیوہ نذیر عباسی شہید